تصوراتِ اقبال

از

مولانا صلاح الدین احمد

شیخ غلام محمد اینڈ سنز سرینگر

قیمت سترہ روپئے

(کوہ نور پریس دہلی)

عرضِ مرتّب

یہ غالباً پندرہ برس کی بات ہے کہ والد مرحوم کے ایک ناشر دوست نے ان سے ان کے مضامین ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کرنے کی اجازت چاہی، لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بارہا مختلف اصحاب نے یہی درخواست کی لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ میں اپنی زندگی میں اپنی کوئی کتاب نہیں چھپانا چاہتا مبادا لوگ یہ کہیں کہ میں اس ذریعے سے شہرت کا متمنی ہوں۔ مولانا کا یہ نقطۂ نگاہ ان کی فطری وضعداری در انکساری کا ایک مثالی مظہر ہے۔ لیکن آج جب کہ مولانا تمام شکوک و شبہات سے ماورئی ہیں، ہمارے لئے اس اہم قومی فریضہ کی تکمیل باعثِ صد فخر و مباہات ہے۔

مولانا کی نگارشات اُردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلاسیکی طرزِ بیان اور جدید رجحاناتِ فکر کا جو حسین امتزاج مولانا

کے ہاں پایا جاتا ہے، وہ کم ہی کہیں اور نظر آتا ہے۔ مولانا کا مقام بطور اسلوب نگار اور نقاد، اُردو ادب کے کسی طالب علم سے مخفی نہیں اور کلام و فکرِ اقبال پر بطورِ خاص ان کی وسیع و عمیق نظر ایک مسلّمہ امر ہے۔ اس بنا پر ہم نے سب سے پہلے مولانا کی وہ تمام نگارشات یک جا کر دی ہیں جو شاعرِ مشرق کے کلام اور فلسفہ سے متعلق ہیں۔ یہ "حدیث سرودِ گل و لالہ" ہدیہ قارئین ہے۔ اس میں وہ تمام شیرینی و لطافت موجود ہے جو مولانا کے اندازِ تحریر و تکلم کا جزوِ خاص تھی۔

مولانا کا عرصۂ تصنیف و تالیف کم و بیش پینتالیس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے اپنے رشحاتِ فکر قلمبند کرنے کے علاوہ ادیبوں کی ایک پوری نسل کی پرداخت کی۔ اتنے بڑے ذخیرۂ علم و فکر کو مجتمع کرنا خاصا دقت طلب مسئلہ تھا۔ لیکن تائیدِ ایزدی اور احباب کے تعاون سے یہ مشکل کام سر انجام پا گیا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کا کرم شاملِ حال رہا تو مختلف موضوعات پر مولانا کے باقی مضامین بھی ایک کتابی سلسلہ کی صورت میں "صریرِ خامہ" کے نام سے جلد شائع کر دیئے جائیں گے۔

اس مجموعے کی ترتیب کے سلسلے میں ہم جناب عبداللہ قریشی مدیر "ادبی دنیا" کے بطورِ خاص ممنون ہیں جنہوں نے ہر مرحلے پر ہماری رہنمائی فرمائی اور عملی طور پر اس کی تشکیل و تکمیل میں سرگرم حصہ لیا۔ ہم جناب شیخ محمود احمد ناظر پی۔ سی۔ ایس کے بھی زیر بارِ احسان ہیں جنہوں نے اس مجموعہ کی تدوین اور طبع و اشاعت میں خاص دلچسپی لی۔ جناب طاہر قریشی

نے ادبی دنیا کے اپنے ذاتی فائل سے ہمیں استفادہ کا موقع دے کر قابلِ قدر امداد فرمائیں۔ جب شمس الدین بٹ صاحب ریجنل ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کمال فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے مولانا کی ریڈیائی تقاریر شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہم ادبی دنیا سے منسلک مفیض الرحمٰن صاحب کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے انتہائی محبت اور انتھک کاوش سے مضامین کی نقول مہیا فرمائیں۔ ان سب اصحاب کی سعی و اعانت کے بغیر مجموعۂ زیرِ نظر کی تشکیل ناممکن تھی۔

معز الدین احمد

۱۴ر مئی ۱۹۶۶ء

نقشِ ثانی

تصوراتِ اقبال کا دوسرا نقش ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس مرتبہ کوشش کی گئی ہے کہ کتاب کے نقشِ اوّل میں جو صوری خامیاں رہ گئی تھیں وہ دور کر دی جائیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق ارزانی ہوئی تو آئندہ کتاب کو مزید بہتر صورت میں پیش کرنے کی سعی کی جائے گی۔

نقشِ ثانی کی موجودہ تشکیل کے سلسلے میں ہم من جملہ اور اصحاب کے جناب اشرف صبوحی صاحب کے خصوصیت سے ممنون ہیں جنہوں نے کمالِ محنت اور خلوص سے مجموعۂ زیرِ نظر کے ظاہری محاسن کی پرداخت کی ہے۔

معزالدین احمد

۱۴ر نومبر ۱۹۶۷ء

فہرست مضامین

مقدّمہ

از ڈاکٹر سیّد عبداللہ

مولانا صلاح الدین احمد ______ کہ جنہیں اس مقدمے میں آگے ہر جگہ ان کی مصنفانہ عظمت کے باعث صرف صلاح الدین احمد ہی لکھوں گا ______ ادیب بھی تھے اور ادیب گر بھی! ان کا کمال یہ تھا کہ وہ ہر موضوع پر قلم اٹھا سکتے تھے۔ اور اس سے بھی بڑا کمال یہ تھا کہ ہر موضوع ان کا خاص موضوع معلوم ہوتا تھا۔ سب موضوعات میں وہ یکتا اور منفرد ثابت ہوتے تھے ______ اور یہ شان ان کے وسعتِ مطالعہ اور ان کی مخصوص طرزِ انشاء کی رہینِ منّت تھی۔

ادب کے موضوعات تو ان کے خاص موضوعات تھے مگر مذہب، سیاست اور ثقافت تک بھی ان کے قلم کی زد میں تھے۔ ادب کی طرح اقبالیات کا موضوع بھی ان کا محبوب و مرغوب مضمونِ مطالعہ تھا۔ موجودہ

مجموعہ ان کے ایسے ہی ۲۳ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے. جن کے تعارف کا شرف آج مجھے حاصل ہو رہا ہے۔

اس مجموعہ کے مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ راز کھلتا ہے کہ صلاح الدین احمد کا مطالعۂ اقبالؔ کتنا وسیع اور غائر تھا ـــــ وہ کس طرح کلام اقبال کی باریکیوں کی معرفت رکھتے تھے اور انہیں اس امر پر پوری قدرت حاصل تھی کہ کسی مسئلہ خاص پر اقبالؔ کے پورے کلام سے استشہاد کر سکیں۔

اس مجموعے میں اقبالؔ کا مردِ مومن اور انسانِ کامل، اقبالؔ کے کلام میں حرکت و حرارت کی اہمیت، نظریہ خودی، تصور شاہین، اقبالؔ کا تغزل، تصوّر مملکت، تصور معیشت، تصور معاشرت، تصور حسن و عشق، وطن و ملّت کی کش مکش اور اس طرح کے چند اور موضوعات پر مقالے ہیں جن میں سے ہر ایک خاص معنویت اور ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

یہ سب موضوعات ایسے ہیں جن پر صلاح الدین احمد کے علاوہ دوسرے درجنوں مصنفوں اور مضمون نگاروں نے قلم اٹھایا ہے اور بحثیں کی ہیں مگر صلاح الدین احمد کے اسلوب نے ان میں ایسی تازگی پیدا کر دی ہے اور ان میں وہ لطافتیں، منظرِ عام پر لاتے ہیں کہ کسی موقعے پر کھینچ کا احساس نہیں ہوتا۔

میں جس حد تک غور کر سکا ہوں ان مضامین میں اسلوب کے اعجاز کے علاوہ جس چیز سے خاص تازگی محسوس ہوتی ہے. وہ یہ ہے کہ صلاح الدین احمد ان موضوعات پر ایک الگ زاویے سے نظر ڈالتے ہیں اور بحث کے

دوران بعض ایسے انکشافات کر جاتے ہیں جو بالکل نئے نہ بھی ہوں۔ تب بھی ان کے قلم کے اعجاز سے تازہ اور نئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ـــــــ

"ان (اقبال) کے معرکہ آرا عروج کا راز ان کی خلوت نشینی اور عافیت پسندی میں پنہاں تھا" (ص۲۱)

اقبالؔ پر بعض نادان لوگوں کو ہمیشہ یہ اعتراض رہا کہ وہ عملی سیاست میں کیوں حصّہ نہیں لیتے۔ اس کا جواب انہوں نے ایک موقع پر خود بھی دیا تھا ؎

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش

اقبالؔ قدرت سے ایک دانائے راز، ایک مفکر اور ایک عارف کا مقدر لے کر آئے تھے۔ جو منصب انہیں تفویض کیا گیا تھا۔ اس میں خلوت گزینی، غور و فکر، مراقبہ و تفکر لازمی تھے۔ فکر کے موتی، خلوت کی غواصی سے ہاتھ آتے ہیں۔ محض فکر شعر بھی اس کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور حکمت عرفاں تو دل کے بحرِ عمیق میں غوطہ لگائے بغیر دشواری سے ہاتھ آتے ہیں ـــــ صلاح الدین احمد نے یہ نکتہ اتنی خوش اسلوبی سے اور طرز دل کشا میں ادا کر دیا ہے کہ پڑھنے والے کے لئے اس کو جذب کرنے اور سمجھنے میں بھی لطف محسوس ہوتا ہے۔

خودی کا تصوّر اقبالؔ کا سب سے بڑا بلکہ واحد مرکزی تصوّر ہے۔ اس پر صد ہا مضامین لکھے گئے ہیں۔ آسان بھی اور عالمانہ بھی ـــــ ! مگر

جو بات صلاح الدین احمد نے اس ایک فقرے میں بتا دی کہ خودی ایمان کے استحکام کا نام ہے اور ایمان کا مطلب ہے علاوہ خدا اور رسول کے مرد مومن کا اپنے اوپر ایمان لانا۔ اس پر دوسرے علماء اور اقبال شناسوں نے طویل مضامین لکھے ہوں گے اور پھر بھی بات اس طرح ادا نہ ہوئی ہوگی! لکھتے ہیں۔

"خودی کا تصور اس جذبۂ مسابقت نے پیدا کیا جو انگریز کے مٹتے ہوئے اور ہندو کی بڑھتی ہوئی یلغار کا نتیجہ ہے۔" (ص۲۳)

بادی النظر میں یہ بات سرسری معلوم ہوتی ہے مگر اجتماعی احوال اور تاریخ کے سیاسی مفکر کے لئے ان کلمات میں زندہ حقیقت پنہاں ہے۔ تاریخ اور واقعاتِ گرد و پیش، ادب اور فکر کی نشو و نما میں جو حصّہ لیتے ہیں ان سے انکار کرنا، جہل و نادانی کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال خود تہذیبی اور سیاسی عوامل کی ایک معجزانہ مخلوق ہیں۔ غالبؔ کو ان کے گرد و پیش نے غالبؔ بنایا اور اقبالؔ کو ان کے سیاسی ماحول نے اقبال مند کیا۔ جرمنی کے مشہور مفکر فختے (FICHTE) کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ فختے کو بھی یہ منصب تفویض ہوا تھا کہ وہ جرمن قوم کو یورپ کی ہم سایہ غالب اقوام کی انتشار انگیز قوتوں سے نجات دلانے کے لئے ایک فکر، ایک فلسفہ اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ فختے کے فکر کا پس منظر بھی سیاسی تھا۔ اقبالؔ کے فکر کا پس منظر بھی یقیناً سیاسی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سیاسی فکر کی غایات اخلاقی اور روحانی بھی ہیں۔

عشق کی بحث بھی اقبالؔ کے اہم مباحث میں ہے۔ اس کے متعلق صلاح الدین احمد جو خلاصہ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

"عشق تمام اقدار اعلیٰ کا حامل ہے جو انسانیت کو الوہیّت سے قریب تر لاتی ہیں۔"

چند الفاظ میں عشق کی اس سے بہتر تفسیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ انسانیت کو الوہیّت کے قریب لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ان صفاتِ عالیہ سے متصّف کرتی ہیں جو اخلاق اللہ کا عکس ہیں (تخلقوا باخلاق اللہ) یہی اخلاقی اقدار اور یہی صفات روحانی، فردِ بشر کے لئے سرمایۂ قوت بھی ہیں اور سرچشمۂ مسرّت بھی۔ ان میں جذب و انجذاب بھی ہے اور وجد و تواجد بھی۔ ان میں قہرمانی بھی ہے۔ اور نیازمندی بھی۔ ان میں فقر بھی ہے اور سلطانی بھی۔ ان میں عبد، عبد بھی ہے اور قابَ قوسین کی منازل بھی! صلاح الدین احمد کے چند جملوں کی میں نے طویل تشریح کی ہے مگر ان کا اجمال میری تفصیل سے اجمل اور اکمل ہے۔

صلاح الدین احمد نے جدید دور میں قیادت کی پانچ کیفیتیں بیان کی ہیں (۱) سرسیّد کی رہنمائی (۲) حالی کی رہنمائی (۳) محمد علی کی رہنمائی (۴) اقبال کی رہنمائی اور (۵) قائداعظم کی رہنمائی۔ (ص ۳۰)

ان کیفیتوں میں فکری رہنمائی کا کامل نمونہ فکرِ اقبالؔ ہے۔ سرسیّد کی رہنمائی عقل پسندی اور مصلحت کی زنجیروں میں مقید تھی۔ محمد علیؔ کی رہنمائی شخصی اور ذاتی افراط و تفریط کی اسیر رہی۔ حالیؔ کی رہنمائی سرسیّد

کی خوش آئند مگر سمت فکر تقلید میں پھنسی رہی۔ قائداعظم ایک عملی رہنما تھے۔ انہوں نے اپنی قانونی منطق کو اپنے استقلال مزاج سے ہم رشتہ کر کے، اس دستور العمل کو کامیاب کرایا جو مفکر اقبال نے ہمارے سامنے پیش کیا۔

اقبال کی رہنمائی کا مسئلہ اہم ہے۔ میں پہلے صلاح الدین احمد کا قول نقل کر چکا ہوں اور اس پر یہ حاشیہ چڑھا چکا ہوں کہ اقبال کا فکر تاریخی عوامل کی پیداوار ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان تاریخی عوامل کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟

یوں تو قرآن و سنّت اور اسوۂ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی ہماری تاریخ کا سرچشمہ ہے۔ اسی سے ہماری قومیت اور اسی سے ہماری تہذیب اور اسی سے ہمارے افکار و علوم اور حیات اجتماعی کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر بھی اقبال کا ایک قریبی عہدِ ماضی بھی تھا ——— غالباً یہ کوئی بڑا انکشاف نہیں کہ اقبال نے روحانی رہنمائی دو بڑے رہنماؤں سے حاصل کی ——— اوّل رومی سے اور دوسرے حضرت مجدّد الف ثانی سے ـــ سر سیّد کی رہنمائی ملکی معاملات میں ایک جزوی دستور العمل کی حد تک بڑا معنی رکھتی ہے ـــ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس محدود دائرے کے سوا، فکرِ اقبال کا افکارِ سر سیّد سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال براہ راست حضرت مجدد سے منسلک ہیں اور اسی دینی انقلاب کے داعی ہیں۔ جو حضرت مجدد کے پیش نظر تھا۔

اُردو فارسی شاعری میں اقبالؔ کی خصوصی اہمیت کیا ہے ؟ —— صلاح الدین احمد کے خیال میں اقبالؔ کا عرصۂ فکر، اس کے شعری اور فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے دوسروں کے مقابلے میں وسیع ہے جہاں دوسرے قریبی اور وقتی جذبوں اور قدروں کو مدنظر رکھتے ہیں۔ وہاں اقبالؔ نے دائمی اقدار کی تبلیغ کی ہے. یہ دائمی اقدار کیا ہیں ؟ خدا کی بادشاہتِ مطلق کا اقرار اور انسان کا خود اپنے اوپر ایمان لانا —— اپنے اوپر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان برحق ہے اور زمین پر خدا کا نائب یا خلیفہ ہے اور یہ اس کے مقدر میں ہے کہ وہ سارے عالم کی تسخیر کرکے اس میں خدا کے نام کی گواہی دے گا. شجاعت، عدالت اور صداقت وہ صفاتِ عالیہ ہیں جن کی اقبالؔ نے تلقین کی ہے۔ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم —— یہ وہ اہم منزلیں ہیں یا اقدار ہیں جن کے ذکر د بحث سے اقبالؔ کی ساری شاعری لبریز ہے۔

نظامِ عالم میں مذکورہ بالا اقدار یا فضائل کو پھیلانے اور ان کو نافذ کرنے کے لئے "مردِ مومن" کی ضرورت ہے. صلاح الدین احمد پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اقبالؔ نے اپنے نظامِ فکر میں فرد کو خاص اہمیت دی ہے، وہ اس "سماجیت" کو نہیں مانتے جو فرد کی صلاحیتوں کو کچل ڈالے. ان کا خیال ہے کہ اقوام کی رہبری، افراد ہی کیا کرتے ہیں. عظیم افراد قوم کے لئے خدا کے انعام کا درجہ رکھتے ہیں۔ مردِ مومن کا تصور، فرد کی صفاتِ عالیہ کے اندر سے ابھرتا ہے. اقبالؔ کا مردِ مومن ایک عجیب دغریب شخص ہے۔

وہ سخت کوش ہے۔ خارا شگاف ہے۔ بے خوف ہے اور بے باک ہے مگر ابریشم کی طرح نرم بھی ہے۔ وہ بخود خزیدہ اور خلوت پسند ہوتا ہے اور اسی خلوت کے اندر سے اس کی وہ شخصیت نمودار ہوتی ہے، جس میں قاہری اور دلبری کا اجتماع ہوتا ہے۔

بخود خزیدہ و مُحکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

صلاح الدین احمد فرماتے ہیں کہ "ارضِ مشرق کی رہبری اس چھوٹے سے ملک کی قسمت میں ہے" ——— یہ اس لئے کہ اقبالؔ کی مخاطب اوّل یہی قوم اور یہی ملک ہے۔ یہی وہ قوم ہے جس نے اپنی قومیت کی بنیاد عقیدے پر رکھی ہے۔ اور عقیدہ بھی وہ جو محدود اور تنگ نظرانہ نہیں بلکہ وسیع اور عالمگیر ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو خدا کی بادشاہت کی قائل ہے۔

اور اس بادشاہت کے لئے اس کے پاس وہ خدائی دستور العمل بھی ہے جو اسے کامیاب بنا سکتا ہے!

صلاح الدین احمد نے اقبالؔ کی شاعری میں دو بنیادی کیفیتوں کا سراغ لگایا ہے، یہ کیفیتیں ہیں حرارت اور حرکت! فرماتے ہیں کہ عربوں کو حرارت سے دلچسپی نہ تھی۔ اور ان کے برعکس ایرانیوں کو حرارت اور آفتاب پرستی سے خاص دلچسپی تھی۔ اقبالؔ عرب و ایران دونوں کے شعری مزاج کے مداح ہیں۔ عربی شاعری سے ان کی دلچسپی بوجہ حرکت

زندگی اور بہ سبب صداقت جذبات کے ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اسرارِ خودی میں لکھا تھا۔ ؎

رجعتے سوئے عرب می بایدت

عربی شاعری کی طرف رجوع کی تلقین اسی بنا پر ہے کہ عرب شاعر زندگی کے تحرک اور جذبوں کی صداقت کے علاوہ اظہار کی سچائی میں اعتقاد رکھتا تھا۔ ایرانی شاعری میں نرمی اور لطافت بہت ہے مگر ایرانی کے داخلی عقیدوں میں حرارت کے لئے خاص میلان پایا جاتا ہے۔ بقول صلاح الدین احمد "اقبالؔ کے ہاں ان دونوں روایاتِ لطیف کا امتزاج ہے۔"

اس کے زیرِ اثر اقبالؔ کی لفظی پیکر آفرینی (امیجری) میں لالہ اور شفق کا استعارہ بار بار آتا ہے۔ لالہ حرارت کا زمینی مظہر ہے اور شفق حرارت کا آسمانی مظہر ہے۔ کرمک شب تاب بھی ان کا خاص استعارہ ہے اور اس سے دلچسپی کی وجہ بھی یہی ہے۔ صلاح الدین احمد کا خیال ہے کہ اقبالؔ کے کلام میں حرارت کے کم و بیش سات تصوّرات ملتے ہیں۔ اقبالؔ تصوّرِ جنّت و جہنّم بھی اسی سے متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ کے اشعار سے ثابت کیا ہے کہ اقبالؔ کے ذہن میں جنت و جہنم کا نقشہ ہے اس میں حرارت ایک خوش آئند کیفیت ہوگی اور جہنم کو ایک " لمس " جگہ بتایا ہے۔

صلاح الدین احمد نے بڑی کاوش سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اقبالؔ کی نظر میں آفتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس معاملہ میں مولانا روم

اور وہ ہم نوا اور ہم مزاج ہیں۔ آفتاب کو خود ہندو دیو مالا اور ہندو فلسفے میں بھی بہت عظیم وجود مانا جاتا ہے۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ایران میں تو خورشید پرستی ایک مسلک بھی ہے۔

یہ غلط فہمی رفع کرنی ضروری ہے کہ اقبال نہ تو ہندوؤں کی طرح آفتاب کو دیوتا مانتے ہیں۔ نہ قدیم ایرانیوں کی طرح اس کی پرستش کرتے ہیں۔ انہیں آفتاب سے دل چسپی محض اس وجہ سے ہے کہ وہ مصدر حرارت ہے۔

اقبال کے غزل کے متعلق یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ ضرب کلیم کی غزلیں خشک، سپاٹ اور محض علمی باتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ صلاح الدین احمد کی رائے میں، "یہ اقبال کے ذہنی سفر کی ایک سمت اور ایک منزل تھی۔ وہ ایک خاص نقطے سے آگے بڑھے اور اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے گئے۔ ابتدا میں داغ وغیرہ کا اثر تھا۔ پھر روایتی معاملہ بندی اور حسن پرستی سے سوز دل اور معرفت نفس کی منزل کی طرف بڑھتے رہے"۔ اور یہ ثابت کیا کہ غزل اتنی محدود شے نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے۔ اس میں ہر مضمون جذب ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ خالص علمی اور سائنسی نظریے بھی غزل میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مضامین کے اس مجموعے میں اور بھی بہت سے مضامین ہیں ان میں سے ہر ایک میں صلاح الدین احمد، ایک رنگ خاص میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ جو حقیقتیں عام سی معلوم ہوتی ہیں اور ہر شخص انہیں پہلے سے جانتا ہے۔ وہ بھی ان کے اسلوب بدیع کی سحر کاری سے نئی اور تازہ اور دلکش اور شیریں معلوم ہوتی ہیں۔ کسی نے خوب کہا تھا کہ اقبال نے حقائق کو

شاعرانہ قالب میں ڈھالا۔ صلاح الدین احمد کا کمال ہے کہ انہوں نے اس شاعری کو پھر نثر کی شاعری میں ڈھال کر لطیف کو لطیف تر بنا دیا۔ پس اگر کوئی یہ کہے کہ یہ مجموعہ اقبال کی شاعری پر ایک شاعرانہ تبصرہ ہے تو حقیقت نہ ہونے پر بھی ہم اسے حقیقت سمجھنے پر مجبور ہیں۔

صلاح الدین احمد کے اسلوب پر اس مقدمے میں تفصیل کے ساتھ کچھ کہنے کی گنجائش نہیں، اپنے ایک اور مضمون میں کہہ چکا ہوں ـــــــ صلاح الدین احمد انشا پردازوں میں سے ہیں جن کا آہنگ ایک مکمل دائرہ بناتا ہے۔ ہر خیال اپنے اظہار کے لئے لہریں بناتا ہے۔ جو خیال بالکل سیدھی اور سپاٹ نثر میں ادا ہوتے ہیں وہ بھی معمولی قوسیں بناتے آگے بڑھتے ہیں مگر شاعرانہ، ادیبانہ اور خطیبانہ نثر، اپنی لہروں کو کم و بیش دائرے کی شکل دیتی ہے۔ اس سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے قاری اور سامع اسی سے متاثر ہوتا ہے۔

صلاح الدین احمد کے اسلوب کے امتیازی اوصاف اس مجموعے کی نثر میں بھی ہیں۔ وہ محمد حسین آزاد، عبدالقادر، ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد کے اسالیب کا امتزاجی نمونہ ہیں۔ صلاح الدین احمد کا ذوق، کسی فقرے یا جملے یا اس کے کسی جزو کو صوتی لحاظ سے نامکمل نہیں رہنے دیتا۔ اس کے لئے علاوہ دائرے کے، ان کی تراکیب کا غائر مطالعہ لازمی ہے۔ جہاں دوسرے ادیب ایک لفظ کا استعمال کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں وہاں صلاح الدین احمد ایک نئی ترکیب، بلکہ بعض اوقات

نئی نئی ترکیبیں استعمال کر کے نثر کی عمارت کو مکمل کرتے جاتے ہیں۔ ذوقی لحاظ سے کسی جگہ شگاف یا خلا باقی نہیں رہتا۔ تعمیر عبارت میں تکمیل کا یہ احساس (جس میں حسن و زیبائی ساتھ ساتھ چلتی ہے) میں نے کسی دوسرے ادیب کے یہاں نہیں دیکھا۔ عبدالقادر کی نظر، لطافت اور آسودہ رفتار پر رہتی ہے۔ جعفر علی خاں کا مطمح نظر، جوش انگیزی ہے۔ اس لئے ان کی نثریں دائرے بنتے ہیں۔ اور پھر نثر نگار ایک دوسرا جھٹکا دے کر پہلے دائرے کو خود ہی توڑ دیتا ہے۔ جوش کا یہ سلسلہ جوشیلی ندی کا سا سماں دکھاتا ہے مگر ذہن کو بالآخر آسودگی نہیں، ہیجان نصیب ہوتا ہے۔ ابوالکلام، جوش کے ساتھ ساتھ علم کی ثقالت کو بھی، نثری آہنگ کے اندر و مکمل کر لے آتے ہیں۔ اور قاری علم سے مرعوب ہو کر سپر ڈال دیتا ہے۔ وہ اس جوش سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے، جو ان تحریروں میں ہے مگر ذہن کو آسودگی نہیں ملتی۔ اندر کی دنیا میں تلاطم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

صلاح الدین احمد، محمد حسین آزاد سے اس لحاظ سے، سب سے زیادہ قربت رکھتے ہیں کہ دونوں کے نثری نمونے، رنگینی کی خوبیوں سے متصف ہیں۔ لیکن آزاد ترکیب سے کام لینے کی بجائے اردو اضافت کا سہارا لے کر داستانی طرزِ تحریر کی طرف نکل جاتے ہیں۔ صلاح الدین احمد داستانی طرز تحریر سے .... جو نکتہ طرازوں اور سلانے والوں کا فن ہے، الگ ہو کر آسودگی بخشنے کے باوجود جوش زندگی کی کیفیت

بھی پیدا کرتے ہیں۔ گویا وہ جوش بھی پیدا کرتے ہیں اور آسودہ بھی کرتے ہیں۔

اس مجموعے کے مضامین، غالباً سبھی مختلف مذاکروں میں پڑھے گئے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان میں جوش کا عنصر زیادہ ہے لیکن چونکہ موضوعات علمی ہیں اس لئے انشا پرداز کا قلم علم کی احتیاطوں سے غافل نہیں رہا۔ وہ علمی حقائق کو شاعرانہ یا ادیبانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ایک دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

قدیم عربی شاعری کی بحث میں لکھتے ہیں۔

عرب کا بادیہ نشین شاعر جس کی زندگی صبا رفتار گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر برق رفتار غزالوں کے تعاقب میں بسر ہوتی تھی، اور جس کا گھر ایک خیمۂ بے نشاں اور جس کا محلہ ایک شعذف رواں ہوتا تھا۔ اگر اس کا شعر سراپا حرکت نہ ہوتا تو یقیناً وہ زندگی سے محروم رہتا اور شعر کہلانے کا حق دار نہ ٹھہرتا۔ چنانچہ فطری طور پر عرب کی صحرائی شاعری کہی اس کی حقیقی شاعری ہے، حرکت کی شاعری ہے۔

اسی مضمون میں لکھتے ہیں۔

اس نے روایت کی انفعالی کیفیت میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکی اور سخن کو شاعر کے کلبۂ احزاں سے نکال کر بہارستان عمل میں آباد کیا ——— چنانچہ جس طرح شتر عجم کے سوزِ دروں

کو فروغ نمود دے کر سرچشمۂ حیاتِ ملّی بنا دیا۔ اسی طرح
شعرِ عرب کی روایاتی تب و تاب کو اپنے سخن میں سمو کر اس
قوّت سے ملا دیا۔ جو اس عالمِ ہست و بود میں نیابتِ الٰہی
کی سزاوار ہے۔

اس عبارت میں ترکیبوں کا تسلسل اور تناسب ملاحظہ ہو۔ انشا پرداز نے آہنگ کو کہیں بے وزن نہیں ہونے دیا۔ اور اس کے ہمراہ علم کی شان بھی ایک رفعت خاص پیدا کر رہی ہے۔

بالِ جبریل کی غزلیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

بالِ جبریل ایک تختۂ گل ہے جس میں لالہ کے ساتھ سمن اور
نیلوفر کے پھول بھی کھل رہے ہیں اور اگرچہ مغزِ سخن سر بہ سر
ایک ہے۔ پیرایۂ سخن بڑے دل آویز انداز میں بدلتا اور ہر نوع
کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔

بالِ جبریل کو تختۂ گل اور اس کی غزلیات کو سمن اور نیلوفر قرار دینا شاعرانہ پیرایۂ سخن سہی مگر مطلب کی بات ادا ہونے کے ساتھ ساتھ جس طرح مطلب کی بات دل نشین ہوئی ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

صلاح الدین احمد کا اسلوب ان کے ذہن اور شخصیت کا عکس ہے۔ اس کی روح عظمت و جلالت اور اس کے ہمراہ دلبری کے شیوے اور رعنائی کے انداز رکھتی ہے۔ صلاح الدین احمد ہندستانی

مسلمانوں کی تہذیب کے عاشق تھے۔ وہ ان اجمالی اسالیب کو پھر زندہ کرنا چاہتے تھے۔ جو عامۃ الورود، سست رگ، ضعیف اور عام پسند نثر کے رواج سے مرچلے تھے۔ ان کی نثر، عظمت و جلال، فقر و قلندری حرکت و حرارت اور لطفِ دلبری کے ان سب نقوش سے متکیف ہے جو اس جلیل القدر انشا پرداز کی شخصیت کو بیسویں صدی کے اُردو ادب کی ایک منفرد ہستی بنانے کے ذمے دار ہیں۔

اقبال کا تصوّرِ شاہین

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذّتِ نیاز نہیں
نگاہ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوار شاہباز نہیں

اقبال کی شاعری میں جن تصوّرات نے علامتوں کا لباس اختیار کیا ہے ان میں شاہین کا تصور ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے بیسویں صدی کا آغاز تھا کہ اقبال کی پہلی نظم ہمالہ منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد پانچ چھ برس تک متواتر ان کی ایسی نظمیں ملک کے سامنے آتی رہیں، جو ان کی حبِّ وطن، ذوق حسن اور ہم آہنگی فطرت کی آئینہ دار تھیں۔ اسی اثنا میں انہیں یورپ کا سفر درپیش آیا۔ اور وہ ایک

عرصے تک کیمبرج اور اس کے بعد ہائیڈل برگ (جرمنی) میں مقیم رہے جرمنی میں اپنے قیام کے دوران میں انہوں نے جن فکری اثرات کو قبول کیا۔ ان میں نطشے کا فلسفۂ "قوت و زندگی خاص طور پر قابل ذکر ہے"۔ نظریاتی حلقوں سے باہر کی فضا بھی ایک ہنگامۂ عمل سے معمور تھی اور متحدہ جرمنی قیصرِ ولیم کی قیادت میں تسخیرِ عالم کی تیاریوں میں ہمہ تن مصروف تھا۔ میری ناچیز رائے میں جرمن قوم کی فعالیت اور بلند نظری اور جرمن فرد کی خود شناسی اور خود اعتمادی نے اقبال کے نظامِ فکر پر ایک گہرا اثر ڈالا ہے اور اس اثر کی ایک یادگار اُن کی فضائے سخن میں اس آسمان سیر پرند کی پرواز ہے، جسے شاہین کہتے ہیں؛ اور جو قیصر کے جنگی خود اور اس کی کوہ شکن سپاہ کے پھریروں اور اس کے جہازوں کے مستولوں پر دنیا کے گوشے گوشے میں متواتر پانچ برس تک اڑتا رہا اقبال کے شعر میں شہباز کی پہلی نمود ہمیں اس کے دورِ اول کی ایک نظم "مرغِ ہوا" میں ملتی ہے جو پہلی جنگِ عظیم میں قریب لکھی گئی ہے

اک مرغِ سرا نے یہ کہا مرغِ ہوا سے
پردار اگر تو ہے تو کیا میں نہیں پردار
گو تو ہے ہوا گیر تو ہوں میں بھی ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے، نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیتِ ہر صاحبِ پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائلِ پندار

مجروح حمیت جو ہوئی مرغِ ہوا کی !
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتارِ دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تری پرواز کی لیکن سرِ دیوار
واقف نہیں تو ہمتِ مرغانِ ہوا سے
تو خاک نشیمن، انہیں گردوں سے سروکار
تو مرغ سرائی خورش از خاک بجوئی
ما در صدد دانہ بہ انجم زدہ منقار

اس میں کوئی کلام نہیں کہ یورپ کی سب سے باعمل قوم کا تصورِ شاہین قوت، تیزی، وسعت نظر، دور بینی اور بلند پروازی کی خصوصیات پر محیط تھا اور اس کے مادی نظریۂ حیات کا صحیح ترجمان، لیکن جب اقبال نے اُسے اپنایا تو اس کی مشرقی روحانیت اس کی اس تخلیق پر غالب آگئی اور اس نے اپنے شاہین کو خصوصیات مذکورہ کے علاوہ درویشی، قلندری اور خودداری و بے نیازی کی اعلیٰ صفات سے بھی مزین کیا۔ اور اپنی قوم کے نوجوان کے سامنے اسے زندگی کا بہترین نمونہ بنا کر پیش کیا۔ شاہین اقبال کی سیرت کی ایک جھلک بالِ جبریل کی مشہور نظم شاہین میں جو اقبال کے دورِ خرد پروری کی یادگار ہے، یوں نظر آتی ہے ؎

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں نہ بلبل   نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم   ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری   جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا   لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

شاہیں کی اس خود بیانی میں لہو گرم رکھنے کا جس انداز سے ذکر آتا ہے اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے مجوزہ نظام زندگی میں خونِ گرم ایک بہت نمایاں کیفیت رکھتا ہے اور یوں تو ان کے کلام میں بیسیوں جگہ خونِ گرم اور جانِ بے تاب کی تپش اور روانی دامن کشِ دل ہے لیکن ایک آدھ مقام پر وہ خونِ گرم کی حیات آفریں کیفیت کو براہِ راست اور بے محابا سامنے لاتے ہیں ؎

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر!
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اور پھر اسی خونِ گرم کی تعریف میں یوں بھی کہتے ہیں ؎

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
جسے ملا یہ متاعِ گراں بہا، اُس کو
نہ سیم و زر سے محبت ہے، نے غمِ افلاس

ظاہر ہے کہ اقبالؔ کا مقصودِ نظر نوجوان، اس اعتبار سے قیصر اور ہٹلر کے معیاری نوجوان سے کسی صورت میں کم نہیں کہ وہ ایک سخت کوش زندگی کا عادی ہے اور ایک تندرست جسم میں ایک صحت مند دماغ رکھتا ہے۔ لیکن اس کی روحانی بلندی اور تندرستی یورپ کے مادہ پرست حلقۂ نظر سے وراءالورا ہے۔ اقبالؔ کا صالح نوجوان، شاہین کے روپ میں جن فضاؤں میں محوِ پرواز ہے۔ وہ مغرب کے تصوّر سے بھی بعید ہیں ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

(اقبالؔ کے ہاں عشق ایک ایسا لفظ ہے جو انسانیت کی تمام اعلیٰ اقدار پر حاوی ہے۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں تو نوجوان اسلام کی حدِ نظر تک انسانیتِ عظمیٰ کے مدارج کا ایک لامتناہی سلسلہ اُس کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ اقبالؔ کا شاہیں جہاں زور و قوت، بلندیٔ پرواز، سخت کوشی اور دور بینی کی خصوصیات رکھتا ہے،) وہاں

وہ بے نیازی، مکروہات دنیوی سے ناآسودگی اور فقر و غنا کی صفات عالیہ سے بھی متصف ہے اور اس کی فلک سیر اڑان درحقیقت اس کی روحانی پرواز کا دوسرا نام ہے۔ وہ اس کی بلندیوں کی ہر منزل پر سرورِ سرمدی کی نئی کیفیات اور علوِ جاوِدانی کی نئی رموز سے آشنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ سرور و کیف اور علم و وجدان کے اس عالم کا ہلکا سا بیان اقبالؔ نے خود شاہین کی زبانِ بے نام میں یوں پیش کیا ہے ؎

اپنی جولانگاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اقوام عالم میں اس وقت زندہ رہنے کی جدّ و جہد نے جو حشر انگیز صورت اختیار کر رکھی تھی، اس کے پیش نظر ایک چھوٹی سی قوم کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کے افراد ہمت و جواں مردی کے پیکر بن جائیں اور زندگی کے ادنیٰ دائروں سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ اقبالؔ کا شاہین اپنے مقابل کرگس میں اسی حد تک مختلف ہے کہ وہ فقر کی بلند اور بے مایہ زندگی کو

مردار خواری کی ذلیل اور شکم سیر زندگی پر ترجیح دیتا ہے، اور ادنیٰ اغراض کی تکمیل کے لئے اپنی فطرت کی آبرو کو داغدار نہیں کرتا ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر آدابِ شہنشاہی!
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اور آخر میں ہم آپ کو اس حکایت منظوم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جس میں علامہ مرحوم نے جرم ضعیفی کو دنیا کا سب سے بڑا جرم قرار دیا ہے اگر ہمیں ایک باآبرو زندگی بسر کرنی ہے تو اس کی اوّلین شرط یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہر لحظہ قوی سے قوی تر بناتے چلے جائیں اور ہر حادثہ ناگہانی اور ہر بلائے آسمانی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہیں. ورنہ ہمارے جینے اور مرنے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّیؔ
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معرّیؔ نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اقبالؔ کا تصوّرِ مملکت

انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں جب مسلمانوں کا آفتابِ اقبالؔ اُفقِ مغرب میں غروب ہو گیا اور دینِ حجازی کا وہ بیڑا جو ایک ہزار برس بیشتر فتح و نصرت کا پرچم لہراتا اور ہوائے کامرانی میں لہلہاتا، سندھ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا۔ گنگا کے دہانے میں آکر ڈوب گیا تو کون

یہ مقالہ انجمن حمایت اسلام کے باسٹھویں سالانہ اجلاس میں زیرِ صدارت جنابِ جنرل سکندر مرزا صدر جمہوریہ پاکستان پڑھا گیا۔ اور اس کی سماعت کے فوراً بعد جناب میاں مشتاق احمد گورمانی، امیر ولایات مغربی پاکستان نے ازراہِ قدر افزائی و نکتہ پروری بطور اظہارِ خوشنودی اس فقیر کی طرف سے ایک ہزار روپے انجمن حمایت اسلام کو عنایت فرمائے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

کہہ سکتا تھا کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ آفتاب بطنِ گیتی سے پھر ایک بار پیدا ہوگا اور یہ ڈوبا ہوا بیڑا چرخِ گرداں کے ایک انقلاب سے ہی پھر اچھل آئے گا۔ لیکن تقدیرِ الٰہی کو یہی منظور تھا۔ کہ سرسید کا خواب اور اقبال کی دوربینی حقیقت کا جامہ پہن لے اور وہ سرزمین جسے سکندر رومی کے عہد سے لے کر گذشتہ صدی کے آغاز تک یعنی کم و بیش دو ہزار برس سے فاتح افواج کے گھوڑے اپنے سموں سے برابر روندتے چلے آئے تھے اور جس کے جفاکش اور وفاکیش باشندے ہمیشہ غیروں کے کام آتے اور انہی کی جنگیں لڑتے رہے تھے۔ تاریخ میں پہلی بار ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے ممالکِ عالم میں روشناس ہوا۔ اور اپنے فرزندوں کے لئے ارضِ پاک کا مقدس رتبہ اور خطاب اختیار کر لے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری اس مملکت کا قیام ایک عظیم معجزے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم، کہ اس معجزے کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور اس کی تکمیل کے شاہد ہیں، ابھی ایک عرصۂ دراز تک محوِ حیرت رہیں گے کہ یہ کیونکر رونما ہوگیا، لیکن حکیم الامت کی نظرِ حقیقت نگر نے آج سے نصف صدی پیشتر اس کے امکان اور اس کے وقوع دونوں کا جائزہ لے لیا تھا اور ملت کو یہ نوید دے دی تھی کہ ؎

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار
ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں
قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

یہ نظم جون ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی تھی۔ جب تخیل کی بڑی سے بڑی پرواز بھی ذہن کو ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی مملکت کے امکانِ قیام سے آشنا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فرنگ کا استعمار چار دانگِ عالم میں نفوذ کر چکا تھا۔ اسلامی حکومتیں اطاعت گزار ریاستوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور مسلمانوں کی واحد آزاد سلطنت یعنی ترکی زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھی۔ ہندوستان کے مسلمان ڈپٹی کلکٹری کو منتہائے زندگی اور انگریز سے شرفِ ہم کلامی کو معراجِ اعزاز سمجھتے تھے۔ خود اس سرزمین کے باشندے جس پر آج سبز ہلالی پرچم لہرا رہا ہے اپنے دلاور فرزندوں کے خونِ گرم سے انگریزی ملوکیت کے شجرِ خاردار کو سینچ رہے تھے۔ اور ہمارے کڑیل جوان فرنگی

شہنشاہیت کا پرچم اٹھائے اُن وادیوں میں گرم تگ و تاز تھے جنہیں اسلام کے دریائے مواج نے اپنی اولیں طغیانیوں میں سیراب و شاداب کیا تھا۔ چاروں طرف ایک زہرہ گداز ظلمت، ہیبتناک اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور ہمارے مقدر کے جھلملاتے ہوئے ستارے بھی غلبۂ فرنگ کے ابرِ محیط میں گم ہو گئے تھے کہ یکایک اس یاس انگیز فضا میں شاعرِ مشرق کی حیات افروز لے یوں بلند ہوئی۔

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

آپ نے ملاحظہ فرمایا، اس القاء کے ساتھ ساتھ کہ ملت کو سرفرازی و برتری کا ایک جدید منصب اور خلافتِ الٰہی کا ایک نیا خلعت عطا ہونے والا ہے، شاعرِ مشرق کو اس امر کا بھی شدید احساس، بلکہ یقینِ محکم تھا کہ مسلم خوابیدہ کو اس نعمتِ عظمیٰ کی پذیرائی کے لئے بیدار اور تیار کرنے کی سعادت خود اسی کے حصے میں آئی ہے۔ چنانچہ القاء و احساس کی یہ دونوں کیفیتیں کلامِ اقبال میں

بار بار نمودار ہوتی اور اپنی ہر نمو کے ساتھ مشاہدات و ممکنات کا ایک جدید و طویل سلسلہ پیش کرتی چلی جاتی ہیں۔

اگرچہ حقیقی اور ارفع شاعری کو میں جزوِ پیغمبری ضرور مانتا ہوں لیکن یہاں مجھے اقبال کے لئے کوئی دعویٰ پیغمبری کرنا مقصود نہیں بلکہ محض یہ جتانا مطلوب ہے کہ آنے والے واقعات شاعر کے ضمیر روشن پر اپنا پیش رو سایہ اس وضاحت سے ڈال رہے تھے کہ اس کی کیفیتوں کے ابلاغ و تبلیغ میں نہ اسے کوئی تامل تھا اور نہ کوئی مشکل درپیش تھی۔ چنانچہ اس احساسِ کامل کے بعد کہ ایشیا کے دل یعنی اس خطۂ پاک میں کہ جس کے مکین ہونے کا شرف ہم سب کو حاصل ہے، عہد تاریخ میں پہلی بار آزادی کا آفتاب طلوع ہونے کو ہے۔ وہ اپنے مخاطبین یعنی اسلامیانِ ہند کو اُن کے مقدر کی طرف بار بار متوجہ کرتا ہے اور بار بار انہیں اس امر کا احساس دلاتا ہے کہ اس نعمت عظمیٰ کا اہل بننے کے لئے انہیں ایک انقلاب کی ضرورت ہے، ایک ایسے خاموش انقلاب کی جو ان کے کردار سے غلامی کا زنگ دھو ڈالے، ذلّت کے نقوش کھرچ دے۔ مسکنت کی کمزوریاں دور کر دے اور انہیں زر و دولت اور جاہ و حشمت کی پرستش سے ہٹا کر اس خداوند قدوس کی عبودیت کی طرف مائل کر دے، جس نے دولت و حشمت کی طاقتوں کو اپنے برگزیدہ بندوں کے قدموں سے لپٹنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ سروں کو جھکانے کے لئے خلق نہیں کیا۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے

اس روحانی انقلاب کی دعوت کے ساتھ ساتھ حکیم الامت نے وہ طریق بھی تجویز کر دیئے جن سے گزر کر یہ انقلاب امت تک، یا امت خود اس انقلاب تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ مذہبِ اسلام کی طرح احیائے اسلام اور قیامِ مملکت اسلام کے یہ طریقے بھی تعداد میں چار ہی ہیں۔ یعنی فقر، خود شناسی جسے خودی کے نام سے موسوم کیا، ایمان اور سخت کوشی مفکرِ اسلام کی ساری تعلیم انہی چار عناصر پر مشتمل ہے اور یہی وہ چار بنیادی ستون ہیں جن پر اقبالؔ کے تصوّر کی مملکت تعمیر ہونے والی تھی۔ حضرات! جب اقبالؔ نے آج سے کم و بیش نصف صدی بیشتر اپنی قوم کے مردِ مومن سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ۔۔

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے!
سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تو اس کی چشمِ جہاں نگر میں وہ تمام ممکناتِ عالیہ روشن تھیں جو فطرتِ مومن کو ودیعت ہو چکی تھیں۔ اور جنہیں معرضِ اظہار میں لانے کے لئے آسے

ایک جدید مملکت کی بادشاہت اور ولایت عطا ہونے والی تھی، اندیشہ شاعر اور فکرِ حکیم کے لئے یہ ایک بڑی گراں پایہ اور نازک کیفیت تھی، چنانچہ کلامِ اقبال کے تمام ابکارِ افکار اور جذباتِ عالیہ اسی کیفیت سے معمور اور اسی کے سرورِ روحانی سے سرشار ہیں۔

جب خداوند جلّ علیٰ کو کسی قسم کی اصلاح و بہتری اور بازیابی منظور ہوتی ہے یا وہ اسے برتری و سروری کے انعامات سے سرفراز کرنا چاہتا ہے تو وہ اس میں ایک ایسا ہادی بھیجتا ہے جو نہ صرف اپنے مشن پر یقین کامل رکھتا ہے بلکہ جو بدترین حالات میں بھی اس نصب العین کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جس کے حصول کے لئے اسے مامور کیا گیا تھا۔ یہ ہادی ایک پیغمبر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ صاحب کتاب نہیں ہے تو اس کا صاحب دیوان ہونا محل اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میری ناچیز رائے میں اسلامیانِ ہند کے لئے حضرت علامہ کا کلام عین وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک گم کردہ راہ قوم کے ہادی کے پیام کو ہمیشہ سے حاصل رہی ہے اور اس پیام کا منشا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں فقط یہی تھا کہ اس خطۂ مینو سواد کے نوجوان جنہیں آزادی کی نعمت عطا ہونے والی تھی اور جو اسلام کی نعمت سے پہلے ہی مالا مال تھے۔ اس فرض کے ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں جو انہیں ایشیا کی سب سے تازہ دم قوم کی حیثیت سے ادا کرنا تھا۔ تعمیرِ مملکت کے عناصر جیسا کہ حکیم الامت نے بار بار کہا ہے، سنگ وخشت یا املاک واموال نہیں ہیں بلکہ وہ دولت لازوال ہے جسے کسی زندہ قوم کا یقین محکم اور عملِ پیہم پیدا

کرتا ہے اور محبت و بلند نگاہی برقرار رہتی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ عالمِ اسلام کا آئندہ مرکز اسی قوم کا وہ گہوارہ بننے والا ہے جو دو ہزار برس سے اقوامِ عالم کی گزرگاہ رہا ہے اور جس کی تاریخ کا ورق اب تک سادہ ہے۔ یونان، مصر، روما، ایران، ہند اور چین کی قدیم تہذیبوں کا انجام شاعرِ حکیم کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ فرنگ کا جلوہ اگرچہ اب تک نگاہِ عالم کو خیرہ کر رہا تھا لیکن اس کی مادہ پرست تہذیب میں زوال و انتشار کے تمام عناصر کارفرما تھے اور وہ خطہ جسے عرفِ عام میں عالمِ اسلام کہتے ہیں، مدت سے بے عملی، سہل پسندی اور فرسودگی کا شکار ہو چکا تھا۔ ترک نے اپنی خلافت کی قبا چاک کر دی تھی اور پیرِ حرم کی کم نگہی نے رسوائیِ حرم کے سامان فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ پس شاعرِ مشرق نے اپنی ہی قوم کے نوجوانوں کو پکارا اور اس کی نگاہوں کو اقبالؔ کے اس آفتاب کی طرف پھیر دیا جو غروب ہونے کے بعد دریائے خون میں ڈوب کر از سرِ نو طلوع ہونے والا تھا ؎

پیرہن پھر فلکِ پیر کا عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

جن حضرات نے کلامِ اقبالؔ کا نظرِ غائر سے مطالعہ کیا ہے، اگر وہ ذرا مزید غور سے کام لیں تو ان پر صاف آشکارا ہو جائے گا کہ فکرِ اقبالؔ کی تمام کاوشیں مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ایک ہی مرکز پر آ کر جمع ہو جاتی ہیں اور یہ مرکز ایک مثالی مملکتِ اسلامی کا تصور ہے۔ اس کی تعلیمِ خودی کا محور فرد کا احساسِ خودشناسی ہے کہ اگر اپنے فطری عروج کو پہنچ جائے تو بیشتر مادی

اور فکر ہی قوتوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ پھر ایمان ہے کہ اس کا اسنحکام ہی روحانی مسرتوں کا کفیل اور تمام دنیوی کامرانیوں کی ضمانت ہے۔ ایمان اپنے خدا پر، ایمان مقصد پر اور ایمان اپنے آپ پر، پھر فقر ہے کہ وہ انسان کو بلندی سے پستی اور حقیقت سے سائے کی طرف مائل ہونے نہیں دیتا اور اس کی وہ بے نیازی اور سرفرازی قائم رکھتا ہے جو اس کا اصلی حق ہے اور زمین پر اس کی خلافت الٰہیہ کے امتیازی نشان رکھتا ہے۔ اور آخر میں سخت کوشی ہے جو ایک ابھرنے والی قوم کے افراد کو مالِ غیر اور رزقِ سہل کے حصول سے باز رکھتی ہے اور ان کی تمام مساعی کو ایک پائدار اور لازوال قوت عطا کرتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے ضمیر پر اس امر کا انکشاف کامل ہو چکا تھا کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب اس کی مخاطب قوم کے صالح ارکان کو ان عناصر چہارگانہ سے ایک مثالی مملکت کی تعمیر کرنی ہوگی۔ چنانچہ ان کے فروغ اور انجذاب پر بار بار اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور قوم کے نوجوانوں کو مسلسل تلقین کرتا چلا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانیں۔ اپنے قوائے وہبی و اکتسابی پر کامل اعتماد کریں، مالِ حرام اور رزقِ مردار کو نفرت کی نظر سے دیکھیں۔ دولت کو اپنے پاؤں کی خاک سمجھیں، اپنی آنکھ کا سرمہ نہ بنائیں اور اپنی نگاہوں کو اتنا بلند اور قوتوں کو ایسا منظم کریں کہ دنیا کی کوئی نجاست اور آلودگی انہیں اپنی طرف مائل نہ کر سکے۔ اور شر کی کوئی طاقت ان پر غالب نہ آسکے۔

شاعرِ مشرق کا سارا حکیمانہ کلام اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ اگر وقت ہوتا

میں آپ کے ساتھ اس گلستانِ شعر و حکمت کے گوشے گوشے کی سیر کرتا لیکن از بسکہ اس فرصت قلیل میں یہ امر ممکن نہیں ہے اس لئے صرف چند اشعار آبدار اپنے اس نظریے کی تائید میں پیش کر کے آپ سے رخصت چاہوں گا۔ فرمایا کہ ؎

ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خوف کو کرے نگیں
تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

یہ ایشیا کی تازہ دم قوم یعنی ہم کم نصیبوں کی طرف اشارہ ہے کہ ؎

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آگیا تو یہی آسماں زمیں

حضرت علامہ کے ہزاروں اشعار کی طرح ان اشعارِ آبدار سے بھی کہ محض ارتجالاً سامنے آئے ہیں۔ ہر شعر میں حکیم الامت کے نسخۂ شفا کے چاروں عناصر موجود ہیں یعنی خودشناسی، فقر، ایمان اور سخت کوشی اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اقبال کی نگاہ میں ان عناصر کا اجتماع ہی ایک مثالی مملکت

کے قیام و دوام کا کفیل ہے۔ بلکہ وہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور مملکت کو نہ صرف ان کے اجتماع کا نتیجہ بلکہ خود ان کے فروغ کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں کہ یہی فروغ مقصد انسانیت ہے۔ یہاں پہنچ کر مردِ مسلماں اوّلیں اور اس کی مملکت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے کیونکہ درحقیقت بندۂ مولا صفات ہی کے دوام سے اس کی مملکت کا دوام وابستہ ہے۔ اگر زمین پر خدا کا نائب ان خصوصیات سے محروم ہو جائے جو منصبِ خلافت سے خاص ہیں تو لاریب اس کی نیابت پر زوال آجاتا ہے یا وہ کسی اور حقدار کو منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی نکتہ پیامِ اقبال کا مرکزی نکتہ ہے اور اس کی تمام دوسری کیفیتیں اسی کے گرد گھومتی ہیں۔

مفکرِ اسلام کی نگاہیں جس آنے والے دور کو دیکھ رہی تھیں، کارکنانِ قضا و قدر کی کسی معمولی توجہ کے کرشمے سے نہ صرف وہ دور اس وقت سے کچھ پہلے آگیا جو اس کے لئے معین تھا بلکہ ہماری گردشِ تقدیر سے وہ آنکھیں بند ہو گئیں جو بہ یک وقت اس کی آمد اور اس کے استقبال کی کیفیتوں پر لگ رہی تھیں۔

اقبال کو ہم سے جدا ہوئے آج اٹھارہ[1] برس ہوتے ہیں اور اس کے وطن کی سرزمین پر آفتابِ آزادی کو طلوع ہوئے اس سے نصف مدت گزر چکی ہے اور مشرق کے دل میں بظاہر وہ مملکت وجود پذیر ہو چکی ہے جس کا خواب شاعرِ مشرق نے دیکھا تھا اور جس کے قیام کی نوید حکیم الامت نے دی تھی۔

---

[1] ۱۹۵۶ء میں

وہ قوم جو گذشتہ اڑھائی ہزار برس سے غیروں کی جنگیں لڑتی اور ان کے پسینے کی جگہ خون ٹپکاتی رہی تھی۔ آج بظاہر اپنے وطن میں آزاد ہے اور وہ تاریخی وقت آن پہنچا ہے جب زندہ قوموں کی صف میں اسے اپنے صحیح مقام تک پہنچنا اور وہ کردار ادا کرنا ہے جو صدیوں سے اپنے ادا کئے جانے کا منتظر تھا۔ لیکن کیا سچ مچ وہ خاموش انقلاب برپا ہو چکا ہے جس کے خروشِ مضمر سے شاعرِ مشرق کا وجودِ خاکی اپنی آخری گھڑیوں تک لرزتا رہا۔ اور کیا واقعی وہ روح بیدار ہو چکی ہے جسے بیدار ہونے پر اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے اور جس کی بیداری ہی ابدی زندگی کا دوسرا نام ہے؛ اس کا جواب شاید ہمیں کوئی نہیں دے سکے گا۔ اس کے جواب میں لب بند اور زبانیں گنگ ہو جائیں گی۔

اقبالؔ کی اس مثالی مملکت میں اقبالؔ کی ملت کی نگاہیں آج اپنے دست و بازو اور اپنے قلب و جگر پر پڑنے کی بجائے کبھی دوسروں کے چشم و ابرو پر اور کبھی اُن بے آبرو سہاروں پر پڑتی ہیں جو خود بھی فانی ہیں اور اپنے پرستاروں کو بھی فنا آلود کرتے چلے جاتے ہیں اور اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

تری فطرت میں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

اقبالؔ کے تصوّرِ مملکت میں آج قوم کی ساری توجّہ متروکہ اموال و املاک پر تصرف پانے اور اُن سے متمتّع ہونے میں صرف ہو رہی ہے اور خون کی وہ حرارت جو تعمیرِ مقدّر اور تزکیۂ نفس کے لئے ضروری تھی، مالِ غیر کو ہضم کرنے اور بلند مقاصد کی قبریں کھودنے میں کام آ رہی ہے حالانکہ اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ؎

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ضمیرِ شاعر پر آنے والے دور کی یہ کیفیت بھی روشن ہو چکی تھی کہ جب افضالِ خداوندی سے خلافتِ الٰہیہ کا خلعت آسمان سے نازل ہو کر اس کی قوم کے جسمِ ناتواں پر راست آ جائے گا تو اس کے شرف اور اس کی ممکنات سے سرشار ہونے کی بجائے وہ بنی اسرائیل کی طرح پھر

ناشناسی اور ناسپاسی کی مرتکب ہوگی اور اللہ کے راستے میں دلیرانہ آگے بڑھنے اور رہنمائی کرنے کی بجائے وہ دنیوی پستی کی رہ گزاروں میں اپنی منزل تلاش کرے گی اور اس جستجو میں بھی غیروں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر ٹھوکریں کھانے ہی کو مآلِ سفر سمجھے گی۔ اس کیفیت کی طرف کلامِ اقبال میں بے شمار اشارات پائے جاتے ہیں۔ اور شاعر بار بار اپنی قوم کو اس لپیٹ میں آنے سے روکتا اور آزادی و حکمرانی کا صحیح مطمحِ نظر اس کے سامنے رکھتا ہے ؎

جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

غیروں کے سہارے جینے اور نام نہاد دولتوں کا مرہونِ منّت اور ممنونِ کرم ہوکر حاکمیت کا عیب پوش فرغل پہن لینے کی نسبت حکیم الامت نے جو کچھ محسوس کیا تھا اس کا عطریہ ہے کہ ؎

کسے نہیں ہے تمنّائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

اور آج انتشارِ افکار کی صورت میں جو مصیبتِ عظمیٰ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی مملکتِ نو میں درپیش ہے۔ حکیم مشرق پر اس کی حکمتات بھی آشکار تھیں اور وہ نہ صرف اس کے وجود کا اشارہ کر گیا تھا بلکہ اس کا علاج بھی بتا گیا تھا ؎

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل!
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد!

اور آخر میں اس انداز پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے جو اقبال کے تصورات

کی مملکت میں رزق اور دولت کی تقسیم نے اختیار کیا ہے اور پھر خداوندِ جلّ علیٰ کے فرمان کی صورت میں حکیم مشرق کے ان جذبات سے اغماض نہ فرمایئے جو اس کے سینۂ صافی میں اس وقت تک برابر مچلتے رہے جب تک انہیں ان شعلہ ریز الفاظ کی صورت نہ ملی ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹّی کا حرم اور بنا دو

مگر مرمریں سلوں کے حرم اور محلات برابر بنتے چلے جا رہے ہیں اور سلطانیٔ جمہور کی آمد آمد کی نوید ان کی تعمیر کے شور میں اس طرح دب کر رہ گئی ہے گویا یہ کبھی سنی ہی نہیں گئی تھی اور اگرچہ ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

لیکن حکیم الامت کی وہ آرزو اب تک نہیں بر آئی کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے!
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اور اگرچہ ؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خوف ریزہ دُرِّ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

لیکن افسوس کہ اس خاکِ پاک نے اپنی بے مثال شادابی کے باوجود ہماری بدنصیبی سے اب تک اس گروہ کارفرما کو پیدا نہیں کیا جو اقبالؔ کی مثالی مملکت میں اپنے ایمان کی تازگی، اپنے یقین کی محکمی، اپنی نگاہ کی بلندی، اپنے کردار کی صلابت، اپنے جذبے کی غیرت، اپنے افکار کی روشنی اور اپنے رزق کی پاکیزگی سے اس مقصدِ عظیم کے قریب جا پہنچتا، جس کے حصول کے لئے خود یہ مملکت معرضِ وجود میں آئی ہے۔ ہیہات اقبالؔ کی روح بے چین ہے اور ے

اک آنے والی اسلامی حکومت کے تصوّر میں
لحد میں بھی کھلی ہے اس کی چشمِ انتظار اب تک

اقبالؔ کا تصوّرِ فقر

عالمِ انسانیت کو جو بڑی نعمتیں اسلام کے ذریعے سے ارزانی ہوئیں ان میں ایک عدل تھا اور دوسرا فقر۔ عدل خود خداوند جل و علیٰ کی، یا کم از کم اس خدا کی جس کا تصوّرِ اسلام نے پیش کیا، سب سے بڑی صفت ہے اور کائنات کا سارا نظام انہی کے سہارے قائم اور اسی کی قوت سے زندہ و پائندہ ہے اور قدرت کے ان رفیع و عظیم قوانین سے لے کر جن میں عالمِ پیدا اور عالمِ پنہاں دونوں مقیّد ہیں، انسان ضعیف البنیان کے اعمال و حرکات تک عدل ہی کے مرہون اور عدل ہی سے مجبور ہیں۔

یہ مقالہ یومِ اقبال ۵۳ء کی تقریب پر بصدارت سردار عبدالحمید دستی وزیر حکومت پنجاب سینٹ ہال لاہور میں پڑھا گیا۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ط وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ط

لیکن عادل جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا خالق کی ایک صفت ہے جسے مخلوق کی طرف منتقل کیا گیا۔ تاکہ وہ لوگ جنہیں خالق کی نیابت عطا ہو، اس کی مخلوق سے معاملہ کرنے میں اس کا نفاذ کریں اور آسمان کی بادشاہت کو زمین پر لائیں۔ اس کے برعکس فقر ایک ایسی صفت ہے جو خالق سے مخلوق کی طرف منتقل نہیں ہوتی بلکہ اصولاً ان مولا صفت بندوں کو عطا ہوتی ہے جنہیں انسانیت کی حقیقی رہبری کا شرف حاصل ہے تاکہ وہ اسے اپنی ذات میں جذب کر کے منشائے خداوندی یعنی عدل کے نفاذ اور خیر کی توسیع کا ذریعہ بنائیں ؂

خاکی و نوری' بندۂ مولا صفات
غالب و کار آفریں کار کشا، کار ساز

قرآنِ حکیم نے جہاں کہیں فقر کا ذکر کیا ہے، اسے التزاماً مسکنت اور رہبانیت سے متمیز کیا جاتا ہے کہ فقر کا نہ اول الذکر سے کوئی واسطہ ہے، نہ ثانی الذکر سے کوئی علاقہ۔ مسکنت جو مذلت کی ہمدم اور ہم قدم ہے۔ ان افراد و اقوام کے حصے میں آئی جنہوں نے ادنی تحقیقات الٰہی یعنی جامد اسباب و اشیاء کو اپنا معبود بنالیا۔ اور اسی کے لئے مر مٹے اور رہبانیت انہیں نصیب ہوئی جو مسخرات و موجوداتِ عالم پر قبضہ کرنے کی تاب نہ لاسکے اور اقدام و اکرامِ خداوندی کے ادنیٰ مظاہر کو بھی اپنے ظرفِ تنگ میں جگہ نہ دے سکے۔ یہاں گر یہ حرص و نامرادی اور دوسرا فریق نااہلی و ناسپاسی سے منسوب

ہو کر نہ صرف قدرت کے عطیاتِ عالیہ سے محروم رہا بلکہ اُس مقصود کا بھی احساس نہ کر سکا، جو انسان کا وہبی اور طبعی حق ہے۔ اور جیسے رضائے الٰہی نے اُس کے لئے مقدر کیا تھا۔ لیکن جن نفوسِ قدسی کو فقر کی دولت مل گئی وہ اس عالمِ اسباب میں نیابتِ خداوندی کے منصبِ جلیل پہ فائز ہوئے اور اس کی اعلیٰ اور ادنیٰ بخششوں کو اُسی کی راہ میں صرف کر کے منشائے ربانی کی تکمیل کا باعث بنے اولٰئک ھم المفلحون واولٰئک ھم الفائزون ط

حضور سرورِ کائنات کی حیاتِ طیبہ از اوّل تا آخر آیۂ فقر کی تفسیر ہے۔ اور بمنزلہ اُس مصدر کے ہے جہاں سے چشمۂ فقر پھوٹتا ہے حضور اس عالمِ کون و مکان میں پہلے انسان ہیں جو بیک وقت فقیر بھی تھے اور بادشاہ بھی اور جن کا فقر شہنشاہی کی زینت اور جن کی شہنشاہی فقر کی قوت تھی۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفےٰ است
ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفےٰ است
ایں دو قوت از وجودِ مومن است
ایں قیام و آں سجودِ مومن است
فقر ذوق و شوق و تسلیمِ رضا است
ما امینیم ایں متاعِ مصطفےٰ است

حدیثِ قدسی ہے کہ خوفتان، الفقرُ والجہاد میرے دو فرقے ہیں۔ فقر اور جہاد۔ نیز فرمایا کہ الفقرُ فخری حضور حیات تک اس دنیا میں ... اپنے ہر عمل سے اس ارشاد کی شرح فرماتے رہے۔ اور

رخصت کے وقت سب سے بڑا ترکہ جو اپنی امت کے لئے آپ نے چھوڑا وہ یہی فقر تھا۔ پھر وہ عالی نہاد جو اس ترکے کے وارث ہوئے مشرق و مغرب کے سلاطین ان کے آگے جھکے اور دنیا نے اپنے پوشیدہ خزانے ان کے قدموں میں ڈالے تاکہ وہ زمین پر آسمان کی بادشاہت قائم کریں۔ ستم رسیدوں کی یاوری فرمائیں۔ محروموں کو ان کا حق دلائیں اور خدا کی دی ہوئی دولت خدا کے بندوں میں اس انداز سے تقسیم کرتے چلے جائیں کہ عدل اُن کا چاؤش اور امانت ان کی نقیب ہو اور پھر چشمِ عالم نے دیکھا کہ جب وہ اپنا فریضہ انجام دے چکے تو شمشیر کی نوک ٹیک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے دامن جھاڑنے سے جو غبارِ زریں پیدا ہوا وہ اہلِ عالم کے لئے سینکڑوں برس تک سرمایۂ زندگی بنا رہا ؎

خلافت، فقر با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است

اقبالؔ کے تصوّراتِ شاعری میں، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، فقر ایک خالص اسلامی تصور ہے۔ اور اس کی ملی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ، خصوصاً اس کے وہ افکار جو فرد کے ارتقاء اور انفرادی سیرت کے فروغ سے تعلق رکھتے ہیں، اسی تصوّر کے گرد گھومتے ہیں۔ شعرِ اقبال میں اس رجحان کا آغاز اس کی شاعری کے اس دور ہی سے ہو گیا تھا، جس کی نمائندگی بانگ درا کرتی ہے ۔ بانگِ درا میں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں اقبالؔ کا شعر جوانی کو پہنچا ہے۔ وہ حسن و عشق کی لطافتوں اور جذب و مستی کی کیفیتوں سے

سرشار ہے اور اُس کا نکھار شاعر کے گلستانِ سخن میں بہار کی آمد آمد کی خبر دیتا ہے، لیکن اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ شاعر ابھی اپنے آپ میں ڈوبا نہیں ہے۔ اس کی نظر گلزارِ ہست و بود کی نیرنگیوں سے بیگانہ نہیں ہو سکی اور اس کا انداز ایک بڑی حد تک ناظرانہ ہے، مفکرانہ نہیں۔ ایسے میں بھی جب وہ فقر کا ذکر کرتا ہے تو وہ اُن بنیادی عناصر سے آشنا معلوم ہوتا ہے، جو آگے چل کر اس کی شاعری میں اس موضوع کی تعمیر کرتے ہیں۔ مثلاً سرسیّد کی لوحِ تربت اُسے پکار پکار کر تلقین کرتی ہے کہ ؎

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تقریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تحریر سے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

بے آزادی، بے خوفی اور ترکِ ترک یقیناً وہ عناصر ہیں جن کے بغیر فقر کی تکمیل نہیں ہوتی۔ آگے چل کر وہ اُس سوز و گداز اور اس تب و تاب کی جستجو کرتا ہے جو صاحبِ دل فقرا اور اہلِ باطن سے خاص ہے ؎

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اُن کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے، انہی خلوت گزینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

اقبال کے اس دورِ شاعری میں ارتقائے تصورِ فقر کی رفتار اگرچہ تدریجی ہے لیکن ہر منزل ایک یافتِ تازہ کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ ذرا آگے بڑھیں تو فقر میں غیرت اور اس بے نیازی کے آثار ملتے ہیں جو اسبابِ و اقدارِ مادی پر قابض و متصرف ہوتے کے باوجود ان سے دامن کشاں رہے۔

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

اور اس نظمِ لطیف سے کہ ایک رنگِ میل کا حکم رکھتی ہے، دو قدم اور بڑھائیں تو وہ بے مثال نظم سامنے آتی ہے جس کا ہر شعر جاذبِ ... ہے اور جس میں فقر کی بے نیازی اور اس کی وہ قوت جو للّٰہیت ... کی ... اپنے عروج پر نظر آتی ہے ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری

دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

شاعر کی راہ گذرِ سخن پر بانگِ درا سے آگے اسرار و رموز اور پیامِ مشرق آئینے سامنے کی دو منزلیں ہیں کہ یہاں پہنچ کر اس کا کاروانِ سخن ایک نئے شوقِ سفر سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ اقلیمِ دل کے سفر کا شوق ہے اور مقصود اس کا معرفتِ نفس ہے۔ از بسکہ اپنے آپ سے، اپنے قوٰی سے، اپنے امکانات سے، اور اپنے مقصود سے آشنا ہونا ہی تکمیلِ انسانیت ہے، تکمیلِ فقر ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے یہ منازل تصورِ فقر کی ارتقائی منازل کا درجہ رکھتی ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اقبال کا مردِ خود آگاہ اور

مردِ مومن، اس کے مردِ درویش اور اس کا احساسِ خودی منصب فقر کے احساس کا ہم معنی ہے۔ اسرار و رموز کے اوراق سر بسر اسی راز کی تفسیر سے معمور ہیں اور پیام مشرق میں جا بجا فقر اور مقامات فقر کے جمالی اور جلالی پہلو، جمالی کم تر اور جلالی بیشتر، ایک طرفہ تازگی اور نادر بیانی سے پیش کیے گئے ہیں۔

پہلے اسرار کا ایک مقام ملاحظہ ہو، جہاں فقر اپنے مقامِ بلند پر پوری استقامت سے قائم ہے اور دنیوی قوت اور تحریص کے سامنے جھکنے سے انکار کرتا ہے ؎

گر بہ اللہ الصمد دل بستہ   از حدِ اسباب بیروں جستہ
بندہ حق بندہ اسباب نیست   زندگانی گردشِ دولاب نیست
پیشِ منعم شکوۂ گردوں مکن   دستِ خویش از آستیں بیروں مکن
چوں علی رضؓ در ساز با نانِ شعیر   گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر
رزقِ خود را از کفِ دوناں مگیر   یوسف استی خویش را ارزاں مگیر
تا توانی کیمیا شو گل مشو   در جہاں منعم شو و سائل مشو
پشت پا زن تختِ کیکاؤس را   سر بدہ، از کف مدہ ناموس را

خود بخود گردد درِ مے خانہ باز
بر تہی پیمانگانِ بے نیاز

اور اس کے بعد ایک واقعہ بیان کیا ہے ؎

قائدِ اسلامیاں ہارون رشید   آنکہ نغفور آبِ تیغ او چشید

گفت مالکؒ[۱] راکہ اے مولائے قوم — روشن از خاکِ درت سیمائے قوم
اے نوا پرداز گلزارِ حدیث — از تو خواہم درس اسرارِ حدیث
لعل تا کے پردہ بند اندر یمن — خیز و در دارالخلافت خیمہ زن
اے خوشا تابانیٔ روز عراق — اے خوشا حسنِ نظر سوز عراق
می چکد آبِ خضر از تاکِ او — مرہم زخمِ مسیحا خاکِ او
گفت مالکؒ مصطفےٰ را چاکرم — نیست جز سودائے او اندر سرم
من کہ باشم بستۂ فتراکِ او — بر نخیزم از حریمِ پاکِ او
زندہ از تقبیلِ خاکِ یثربم — خوشتر از روز عراق آمد شبم
عشق مے گوید کہ فرمانم پذیر — پادشاہان را بخدمت ہم مگیر
تو ہمی خواہی مرا آقا شوی — بندۂ آزاد را مولا شوی
بہر تعلیم تو آیم بر درت — خادمِ ملت نہ گردد چاکرت
بہرہ خواہی اگر از علمِ دیں — در میانِ حلقۂ درسم نشیں

بے نیازی نازہا دارد بسے
ناز او اندازہا دارد بسے

اب قبل اس کے کہ پیام مشرق کا ایک دُرِ بے بہا آپ کی خدمت میں پیش کروں، میں آپ سے یہ سوچنے کی التجا کرتا ہوں کہ آج ہمارے اربابِ علم و فن اور اصحاب رشد و ہدایت میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جو اہلِ اقتدار کے ایک ادنےٰ اشارے اور حصول جاہ و مال کی

۱؎ امام مالکؒ

ایک خفیف سی امید پر اپنے مناصب اور اپنے وظائف، اپنے فرائض اور اپنے مقاصد طرفۃ العین میں ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاتے۔ بغداد مٹ گیا، لیکن کراچی باقی ہے فاعتبروا یا اولی الابصار

پیامِ مشرق میں شاعر کے کلام پر ایک طرفہ نکھار ہے اور اس کے ساتھ اس کے انداز بیان میں بھی ایک حیرت انگیز نقار نظر آتا ہے۔ الفاظ کی تازگی و شگفتگی، تراکیب کی رعنائی اور ندرت کو اس انداز سے سہارا دیئے چلی جاتی ہے کہ نہ فکر اظہار پر گراں نظر آتا ہے، نہ اظہار فکر سے نظر چراتا ہے اور سخن کے یہ دونوں عناصر اس انداز سے ہاتھ دیئے بڑھے چلے جاتے ہیں کہ ان کی رفتار پر رقص کا گمان ہوتا ہے۔ رقص گفتار بھی اور رقص انکار بھی۔ اس انداز میں شاہد فقر کا ایک اور جلوۂ جہاں آرا ملاحظہ فرمایئے ؎

موج را از سینۂ دریا گسستن می تواں
بحرِ بے پایاں بجوئے خویش بستن می تواں
از نوائے می تواں یک شہر دل در خوں فشاند
یک چمن گل از نسیمے سینہ خستن می تواں

اس غزل کا موڈ اور اس کی فضا شروع سے آخر تک ایک ہے ؎

می تواں جبریل را گنجشکِ دست آموز کرد
شہپرش با موئے آتش دیدہ بستن می تواں

گر نہ خود محکم شوی سیلِ بلا انگیز چیست
مثلِ گوہر در دلِ دریا نشستن می تواں

اور حاصل غزل ملاحظہ ہو ؎

من فقیرِ بے نیازم مشربم ایں است و بس
مومیائی خواستن نتواں شکستن می تواں

پیامِ مشرق سے جاوید نامہ تک پہنچتے پہنچتے شاعر کے تصوّرِ فقر میں ایک عجیب و غریب براقی اور تیزی پیدا ہو گئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقر اس کے ہاتھ میں ایک تلوار کے مانند ہے جس سے وہ کائنات کو تسخیر کیا چاہتا ہے۔ جاوید نامے کے بعض مقامات اس درجہ جلالی ہیں کہ میری ناچیز رائے میں یہاں پہنچ کر خود فقر رعشہ بر اندام ہو جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

من نہ گویم در گذر از کاخ و کو
دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بو

تیشۂ خود را بکہسارش بزن
نورے از خود گیر و بر نارش بزن

از طریقِ آذری بیگانہ باش
بر مرادِ خود جہانِ نو تراش

دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر
صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

دل برنگ و بوِ کاخ و کو مدہ
دل حریمِ اوست جز با او مدہ

مردنِ بے برگ و بے گور و کفن
گم شدن در نقرہ و فرزند و زن

ہر کہ حرفِ لا الٰہ از بر کند
عالمے را گم بخویش اندر کند

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست
فقر سلطانی ست رہبانی کجاست

گرچہ باشی از خدا وندانِ دہ
فقر را از کف مدہ از کف مدہ

در جہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ
نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ

کثرتِ نعمت گداز از دل بُرد
ناز می آرد نیاز از دل برد

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام
نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام

من فدائے آنکہ درویشانہ زیست
وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

اور اب عروج ملاحظہ ہو ؎

مردِ حق از آسماں افتد چو برق
ہیزم او شہر و دشتِ غرب و شرق

ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات
او شریکِ اہتمامِ کائنات

او کلیم و او مسیح و او خلیل
او محمدؐ او کتاب او جبرئیل

آفتابِ کائناتِ اہلِ دل
از شعاعِ او حیاتِ اہلِ دل

اول اندر نارِ خود سوزد ترا
باز سلطانی بیاموزد ترا

جاوید نامہ میں، جیسا کہ میں نے عرض کیا، فقر نے مقاماتِ جلال طے کئے ہیں اور وہ ایک حقیقتِ ثانیہ بن کر انسان کی اعلیٰ قوتوں پر نافذ ہو گیا ہے۔ آخر اشرف المخلوقات کا منصب یہ تو نہیں کہ وہ اپنی عظمتِ وہبی کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور اس جہانِ بے مایہ کی فرو تر قدروں کو اپنا معبود بنا لے۔ یہ دنیا اس کے لئے خلق کی گئی ہے وہ اس دنیا کے لئے خلق نہیں کیا۔ پس جب وہ اپنا منصب نہیں پہچانتا اور اعلیٰ علیّین سے اسفل السافلین میں گرنا چاہتا ہے تو بلاشبہ وہ اپنی

انسانیت کی تحقیر کرتا ہے۔ اور اپنے منصب سے دست کشی اختیار کرتا ہے پس اس کے لئے موت ہے اور موتِ ابد اور صاحبِ فقر کے لئے حیات ہے اور حیاتِ جاوید ؎

قلندراں کہ بہ تسخیر آب گِل کوشند
زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اندو کمندے بہ مہرو ماہ پیچند
بخلوت اندو زمان و مکاں درآغوشند
بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند
نظام تازہ بچرخِ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند
زمانہ از رخِ فردا کشود بندِ نقاب
معاشراں ہمہ سرمستِ بادۂ دوشند
بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت
بحیرتم کہ فقیہانِ شہر خاموشند

زبورِ عجم کی یہ تفسیر دل افروز شاہدِ فقر کے جمال جہاں آرا کا وہ منظر پیش کرتی ہے جسے اس کی تابِ جلال نے آنکھوں سے چھپا رکھا تھا اگرچہ بنیادی طور پر ان دونوں کیفیتوں کا مصدر ایک ہے۔ میری مراد فقرِ کامل سے ہے۔ جسے اقبال کا تصور کبھی حیدرؓ کرار میں مجسم دیکھتا ہے۔ کبھی

فاروق اعظم رضؓ میں، کبھی اُسے بوذر رضؓ میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے کبھی سلمان رضؓ میں، کبھی وہ عالمگیرؒ کی صورت اختیار کرتا ہے کبھی امام مالکؒ کی، لیکن جب وہ دورِ حاضر کی طرف نظر کرتا ہے تو اس کی نگاہیں اپنے دامن میں اک کربِ بے حساب لئے واپس آجاتی ہیں۔ آج کا نوجوان شاعرِ مشرق کے تصوّر سے بھی عاری ہے۔ فرنگ کی طویل غلامی نے اُسے روزی کا بندہ بنا دیا ہے۔ اور اس کی نگاہ اس سے آگے نہیں جاتی۔ وہ یہ بھول چکا ہے کہ وہ اس ملّت کا فرد ہے جو تسخیرِ ارض پہ مامور ہوئی تھی اور اس لئے مامور ہوتی تھی کہ زمین پر آسمان کی بادشاہت کو واپس لائے اور زمین کے خزانوں کو اہل زمین کی فلاح و بہبود پہ صرف کرے۔ وہ یہ بھول چکا ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کا رکن ہے جس میں دینا زندگی کا ہم معنی تھا اور لینا موت کا۔ وہ یہ بھی فراموش کر چکا ہے کہ زمانے کی گردشیں اس کے لئے وقف ہیں، وہ زمانے کی گردشوں کا اسیر نہیں ہے اور وہ یہ بات بھی ذہن سے نکال چکا ہے کہ اس کے لئے صرف وہی رزقِ حلال ہے جو بازو کی قوّت اور ماتھے کے پسینے سے کمایا جائے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور پھر ساتھ ہی ان خستہ دلوں کے لئے جو حصولِ اسباب سے مایوس ہو کر ترکِ اسباب میں تسکینِ دل کی جستجو کرتے ہیں۔ فرمایا ؎

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے ترک سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

یہ اشعار بالِ جبریل سے لئے گئے ہیں، جو جاوید نامے کے بعد تصوراتِ اقبال کا تسلسل قائم رکھتی ہے۔ بالِ جبریل کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقر کے تصور کو اقبال نے پہلی بار جامد کر کے جسم عطا کیا ہے اور یہ جسم اس کے محبوب پرند شاہین کا ہے۔ اقبال شاہین میں فقر کے تمام تصوراتِ کو یک جا دیکھتا ہے اور اسے پرندوں کی دنیا کا درویش کہہ کر پکارتا ہے۔ فقر کی تیز نگاہی، فقر کی آزادروی، فقر کی بلند پروازی فقر کی بے نیازی، فقر کی سخت کوشی اور فقر کا کسبِ حلال اس شہباز میں مجسّم نظر آتا ہے۔ جو زمین کی پستی کی بجائے آسمان کی بلندیوں پر نگاہ رکھتا ہے، جو اپنا نشیمن چٹانوں میں بناتا ہے اور اپنا شکار جھپٹ کر مارتا ہے۔ اقبال اپنے شاہین کو عہدِ حاضر کے نوجوان کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ عہدِ حاضر کا

نوجوان شاہینی کی بجائے کرگسیت کی طرف زیادہ مائل ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں کی محنت کا پھل کھانے سے خاص رغبت رکھتا ہے اور غیر کے ترکے میں اپنی زندگی کا سامان تلاش کرتا ہے۔

آج اگر کسی معجزے سے اقبال زندہ ہو جائے تو کرگسوں کی اس قوم کو ہرگز نہیں پہچان سکے گا۔ جو غیر کے مالِ متروکہ پر تصرف کے لئے ہر وقت آپس کی چھینا جھپٹی میں مبتلا ہے۔ اور جو ادنیٰ اسبابِ دنیا کو معبود بنا کر ذلت و مسکنت کی پستیوں میں گرتی چلی جا رہی ہے اور پھر اپنے آپ کو بڑے ذوق و شوق سے مومن بھی کہلواتی ہے ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

بالِ جبریل کے بعد ضربِ کلیم میں تصوّرِ فقر کے مختلف پہلو ایک نئے انداز اور ایک نئے اسلوب میں سامنے آتے ہیں۔ ان میں بعض کا حسن و جمال دیدنی ہے ؎

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی
روشن اسی سے خرد کی آنکھیں — بے سرمۂ بو علی و رازی

حاصل اس کا شکوہ محمود فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل رکھتا نہیں ذوق بے نوازی
ہے اس کی نگاہ عالم آشوب در پردہ تمام کارسازی
یہ فقر غیور جس نے پایا بے تیغ و سنان ہے مرد غازی
مؤمن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

فقر، جیسا کہ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا، بندۂ مقبول کے لئے خالقِ کائنات کا ایک تحفہ ہے، جس سے آراستہ ہو کر وہ معاشرے کی قیادت سنبھالتا اور اپنے سوز، اپنی غیرت، اپنی بے نیازی، اپنی بلند نگاہی اور اپنی للّٰہیت کی قوت سے اُسے منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ آج ملتِ اسلام کی قیادت محض اس لئے ناکام ہے کہ اس کی آنکھوں کی نمی اور اس کے دل کا سوز غائب ہے۔

فقر بیک وقت قیادت کی قوت اور اس کا زیور ہے۔ پس جس قوم کی قیادت سے فقر چھن گیا وہ شکوہِ جلال اور شانِ جمال دونوں سے محروم ہو گئی۔

یاد رکھئے کہ دنیا کے بڑے بڑے کام، ایسے کام جن کی بدولت یہ جہانِ پیر مٹ مٹ کر پھر سے زندہ اور اُجڑ اُجڑ کر پھر سے آباد ہوا فقرا ہی نے انجام دیئے اور یہ راز جس نے آشکارا کیا وہ بھی تو ایک فقیر ہی تھا ؎

سرودِ رفته باز آید که ناید
نسیمے از حجاز آید که ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید که ناید

اقبال کا تصوّرِ معیشت

مملکت خداداد پاکستان کا قیام بیسویں صدی کا ایک معجزہ ہے۔ اور اگرچہ مستقبل کا مؤرخ اپنے وقت پر اس کی تخلیق کے اسباب کا تجزیہ کرنے اور ان عناصر کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گا جو اس کے ظہور و قیام پر منتج ہوئے۔ لیکن میرے ناقص خیال میں آخر کار اسے یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ شاطرِ فرنگ کی بدحواسی اور یارانِ وطن کی بے خبری کے سوا قدرت کا ایک زبردست ہاتھ واقعات و حوادث کو بڑی سرعت کے ساتھ آگے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اور اسباب و نتائج کی وہ بیشتر منطقی کڑیاں جو تاریخ کی مسلسل کیفیتوں کو آپس میں ملاتی ہیں ایک ایک کر کے ٹوٹتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ اس امر سے ہرگز انکار نہیں کر سکے گا کہ کوئی غیبی طاقت اس فوزِ عظیم کے پس پشت ضرور موجود تھی جو

ایک کمزور، زوال پذیر اور نا تربیت یافتہ قوم کو ایک مملکت سونپ کر اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ اہلِ دنیا کے دیکھتے دیکھتے چشم زدن میں دنیا کی وہ سب سے بڑی مسلم مملکت قائم ہوگئی جس کے قیام کا خواب اس کے مفکرِ اعظم نے صرف چند سال پیشتر دیکھا تھا اور جس کی تعمیر کو اپنی چشمِ ظاہر سے دیکھے بغیر وہ اپنے خالق سے جا ملا تھا۔

اگر یہ سچ ہے کہ آنے والے واقعات سعید ارواح اور حساس قلوب پر اپنا پیشرو سایہ ڈالتے ہیں اور اگر یہ سچ ہے کہ شاعری پیمبری کے اجزاء میں سے ایک جزو لطیف ہے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کی نگاہِ حق پرست برسوں پہلے اس انعام خداوندی اور اکرامِ ربانی کا نظارہ کر چکی تھی جو دنیا کے اس حصے میں درگاہ حق سے ہم نا اہلوں اور ناسپاسوں کو عطا ہونے والا تھا۔

شاعرِ مشرق کو اس کا بھی شدید احساس بلکہ یقین تھا کہ اپنی قوم کو اس نعمتِ عظمیٰ کی پذیرائی کے لئے بیدار اور تیار کرنے کی سعادت بھی خود اسی کے حصے میں آئی ہے۔ چنانچہ القا و احساس کی یہ دو کیفیتیں کلامِ اقبال میں بار بار نمودار ہوتی اور اپنی ہر نمو کے ساتھ مشاہدات و ممکنات کا ایک حیرت انگیز سلسلہ پیش کرتی ہیں۔ غور فرمائیے کہ تبت اور ہمالیہ کے وسیع و عریض اقطاع پر اشتراکی چین کا نفوذ ابھی کل کی بات ہے لیکن حضرت علامہ نے آج سے کم و بیش ربع صدی پیشتر برملا کہہ دیا تھا کہ ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

اس ثبوت کی پیش کش سے میں ہرگز آپ کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے نہیں کہتا کہ حکیم الامت کو آنے والے واقعات کا یقینی علم تھا۔ بلکہ میرا ادعا محض اتنا ہے کہ اس حصۂ عالم میں جو انقلابات آنے والے تھے وہ اپنا سایہ اقبال کے ضمیر روشن پر برابر ڈال رہے تھے۔ اور اقبال غیر شعوری طور پر ان سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ جلد از جلد اپنی قوم میں وہ تمام ضروری صفات پیدا کر دینا چاہتے تھے جن سے نیابتِ خداوندی کا کردارِ عظیم ادا کرے۔ نیز اولی ایک منتخب و محبوب قوم کا منصف ہونا ان کی نظر میں ضروری تھا چنانچہ تعلیمات شاعر نے اپنے دورِ وسطیٰ میں تعلیمات حکمیہ کا رنگ اختیار کر لیا اور فکرِ اقبال میں خودی، ایمان اور فقر کے عناصرِ سہ گانہ اس مہانہ انداز سے ابھرے کہ چشمِ عالم کھلی کی کھلی رہ گئی اور جو اہلِ دانش ان سے آشنا ہوئے وہ آج تک عالمِ حیرت سے برآمد نہیں ہو سکے۔

اقبال نے علم و حکمت کا جو نسخہ، کامل آزادی و پادشاہی کے استقبال کے لئے تیار کیا تھا وہ اس نے اپنی قوم کے نوجوانوں کے سامنے پیش کیا کہ فسودگان بے عمل سے ایسے اس کی پذیرائی کی توقع کوئی نہیں تھی۔ اس نسخے کے اجزائے سہ گانہ میں خودی تھی کہ فرد کو اپنی اخلاقی اور روحانی

عظمت کے ایک شدید احساس سے مالامال کرتی تھی۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو پستی و نکبت دنابت و ذلت اور کمزوری و بے ہمتی کی ہر کیفیت سے بالاتر سمجھے اور ان کی سطح تک نیچے اتر نا یا ان سے منسوب ہونا کسی صورت میں گوارا نہ کرے۔ پھر انہی اجزا میں سے ایک ضروری جزو ایمان تھا۔ اس ذاتِ بے ہمتا اور اس کی لامحدود قدرت پر ایمان، اس کی عطا کردہ اہلیتوں پر ایمان اور اس دنیا میں خود اپنے مشن پر ایمان اور آخری جزو فقر تھا۔ جو مردِ مومن کو بیک وقت دولت دنیا اور اس سے بے نیازی کی حیرت انگیز صفت عطا کرتا اور عام اہل دنیا سے ایک عظیم وجۂ فوق و امتیاز بخشتا تھا۔

اقبالؔ کو یقین تھا کہ جب اس کا مثالی نوجوان ان صفات عالیہ سے متصف ہو کر عرصۂ عالم میں اترے گا تو نہ صرف وہ اس بادشاہی کا اہل ثابت ہوگا جو اسے عنقریب عطا ہونے والی تھی بلکہ انہی بے مثال اسلحہ کی مدد سے وہ اس کا اور اس کے ساتھ خود انسانیتِ عظمیٰ کا تحفظ بھی کر سکے گا۔ ضمیر اقبالؔ پر یہ حقیقت بھی روشن تھی کہ اس دورِ تقابل و تکاثر میں کسی چھوٹی قوم کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ وہ اپنے روحانی اور تمدنی تقاضوں کے مطابق اطمینان سے آبرومندانہ زندگی بسر کر سکے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک وہ قوت و صلابت اور کردار و سیرت کے اعتبار سے ایک نہایت باجبروت قوم نہیں بنے گی۔ اس کے لئے اس زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا تو کجا عزت کے دو سانس لینا بھی ممکن نہیں ہوگا۔

چنانچہ انہوں نے اسے مال و دولت جمع کرنے اور ساز و سامان سے آراستہ ہونے کا طریقہ نہیں بتایا۔ بلکہ نیابتِ الٰہی کا وہ اصول سمجھایا جو نورِ عظیم کی منزل کو قریب تر لاتا اور انسان کو فوق البشر کی اعلیٰ قوتوں سے بہرہ ور کرتا ہے۔ فرمایا کہ ؎

یہ نکتہ سرگزشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے!

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

پھر فرمایا کہ ؎

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمّت ہو پَر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پَر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

اور جب خودی، ایمان اور فقر کے یہ عناصر سہ گانہ ایک نسخہ کامل میں ترتیب پا چکے تو حکیم الامت کے منشاء کے عین مطابق اس میں سے ایک بے داغ تندرست اور توانا معاشرت کا تصوّر ابھرا، ایک ایسی معاشرت

کا تصور جو ایک قوم تازہ اور اس کے افراد تازہ تر کے لئے نہ صرف ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ بلکہ اس امر کا بھی ضامن تھا کہ بالآخر وہی ان کے لئے بقائے دوام اور راہبری اقوام کے حصول کا موجب بھی ثابت ہوگا۔

حکیم الامت آج سے ٹھیک بیس برس پہلے واصل حق ہو گئے تھے اس وقت ہماری معیشت کے نقشے میں ان میلانات و رجحانات کا نشان تک پیدا نہیں تھا۔ جو تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد معرض وجود میں آئے۔ مثلاً اس زمانے میں املاک متروکہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ابھری تھیں لیکن اس جنس فاسد نے ایک پاک مملکت کی فضا میں جو انتشار و فساد پیدا کیا اور جس انداز سے ایک قوم کی قوم کے مزاج کو بدل کر رکھ دیا۔ حیرت ہے کہ وہ اس آشنائے راز کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ چنانچہ اس نے کسی موجود موقع و محل یا کسی ظاہری محرک کے بغیر اپنی قوم کے نوجوان کو بار بار بہ تاکید و تنبیہہ کی کہ وہ مال غنیمت پر ہرگز نگاہ نہ رکھے اور اس زہر کو کبھی اپنی روزی کا ذریعہ نہ بنائے۔ کلام اقبال میں شاہین کے مقابل کرگس کی پیش کش اسی تاکید و تنبیہہ کی ایک ادبی تشکیل ہے ؎

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

شاہیں کو تنومندی، بلند پروازی، سیر چشمی اور بے نیازی کا مجسمہ بنا کر اپنی قوم کے جوانانِ فردا کے سامنے پیش کرنے سے اقبالؔ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انہیں راہبانہ صفات سے متصف ہونے کی ترغیب دے یا انہیں دنیا اور اس کے متعلقات سے متنفر و بیزار کر دے بلکہ اس کے خلاف اقبالؔ کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانانِ قوم اپنی سیرت میں صلابت اور نظر میں دور بینی پیدا کریں۔ اور دوسروں کی فتوحات و املاک سے ایک درویشانہ بے نیازی کی عادت ڈالیں۔ تاریخ انسانی کے اوراق اس کے سامنے کھلے تھے اور وہ جانتا تھا کہ وہی قوم دنیا میں پائدار سطوت اور محکم بلندی حاصل کر سکتی ہے جو اسباب دنیا حاصل تو کرے لیکن انہیں ہمیشہ اپنے قدموں تلے رکھے، اپنا معبود نہ بنائے۔ شاہین کا تصوّر اسی تقاضے کی تخلیق تھا۔ اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ شاعر کے ضمیر پر یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ اس کی قوم کا ایک بڑا عنصر اقتدار حاکمانہ سے حاصل ہوتے ہی اپنے پیش رو لوگوں کی املاک پر کرگس وار جھپٹے گا، اور مردہ خوری کی آویزش میں اس سطح سے بھی گر جائے گا جس سطح پر فضلِ خداوندی نے اسے پایا اور آزادی کی نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ اسی لئے وہ بار بار اپنی قوم کے جوانوں کو کرگسیت سے متنفر کرنے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔

دلِ زندہ و بیدار ہو اگر ہو تو بندر تیج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگران اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

حضرت علّامہ کی زندگی میں ہندوستان کے جو علاقے انگریز کے حاکمانہ تسلّط سے ذرا کم متاثر تھے۔ وہی زیادہ پس ماندہ اور دنیوی اعتبار سے زیادہ مفلس تھے۔ میری مراد ہمارے قبائلی علاقوں سے ہے جن کی آزادیؔ عشرت لازم و ملزوم تھیں۔ شاعر کی نگاہِ دور بیں نے جب اُن اثرات کا مطالعہ کرنا چاہا جو ان عناصر کے باہمی ردِ عمل سے پیدا ہوئے ہیں تو لامحالہ اس کی نگاہیں انہی خطوں اور ان کے رہنے والوں کی طرف اٹھیں اور بار بار اُٹھیں۔ اور تاریخ کے دھندلکوں کو چیرتی ہوئی سکندرِ اعظم کے زمانے تک چلی گئیں اور جب واپس آئیں تو وہ اس کیفِ روحانی سے گراں بار تھیں۔ جو کوہستان کے ان فرزندوں کو آزادی و خوشحالی کی جنگ باہم میں آزادی کی کامرانی سے حاصل ہوا تھا اسے کیا خبر تھی کہ وہ وقت بھی عنقریب آنے والا ہے۔ جب اس کے اپنے وطنِ عزیز میں آزادی و خوشحالی کی جنگ ایک اور صورت میں بپا ہو گی اور حیلہ گرانِ فرنگ زر و سیم سے توپ و تفنگ کا کام لے کر اس سرزمینِ پاک کو پھر اپنے

زیر نگیں لانے کی سعی کریں اور کیا عجب کہ کامیاب ہو جائیں۔ حکیم الامت نے یہ معرکۂ روح و بدن آج سے ربع صدی پہلے ایک اور رنگ میں دیکھا تھا اور اپنی ملت کے نوجوانوں کو اس کے نتائج سے محراب گل کی زبان میں یوں خبردار کیا تھا ؎

میرے کہستاں! تجھے چھوڑ کے جاؤں کہاں!
تری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک
باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظِ بدن کے لئے روح کو کر دوں ہلاک
اے مرے فقر غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

اور اس کے اس سوال کا خود ہی یہ جواب بھی دے دیا تھا کہ ؎

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اور فقر غیور کے اسی فیصلے کو ایک اور اسلوب میں جو ایک وسیع تر سطح پر حاوی ہوتا ہے۔ یوں بیان فرمایا کہ ؎

من کی دنیا؛ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؛ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من باقی نہ تن

اور محرابِ گل کے بعد فقر و آزادی کے اور محسیے یعنی سرحد کے ایک بڈھے بلوچ کی زبانی نوجوان فرد اسے یوں خطاب فرمایا کہ ؎

جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اور وہ اشارا یہی تھا کہ جب روح و بدن کے معرکے میں انتخاب کا

وقت آئے تو روح کو بدن پر اس لئے ترجیح دو کہ بدنوں کی دنیا میں تمہارا بدن کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ دور حاضر کی مادی دوڑ میں تم بہت دیر سے شامل ہوئے ہو اور جب تم فرنگ کے خوان کرم کے موجودہ ریزوں کو چنو گے اس کا ایک اور خوان افضائے غرق د غرب میں بچھ جائے گا۔ پس اپنے آپ کو پہچانو، اپنی عظمت خوابیدہ کا جائزہ لو اور اپنے نفسِ مطمئنہ کی قوت بے نہایت سے اس فوز کبیر تک پہنچ جاؤ۔ جہاں دولت تمہارے قدموں کی خاک بن کر رہے، تمہاری آنکھوں کا سرمہ بن سکے۔

کسی قوم کی معیشت میں وسائلِ دولت کی تقسیم نہ صرف ایک نہایت اہم مقام رکھتی ہے بلکہ ایسے مسائل بھی پیش کرتی ہے جو اس کی داخلی زندگی اور اقوام عالم میں اس کے مقام دونوں پر بدرجہ نہایت اثر انداز ہوتے اور ان کے تعین میں ایک حصہ وافر لیتے ہیں اور دور حاضر میں تو یہ مسئلہ تقسیم دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے اور نظریاتی اعتبار سے اس کی بنا پر انسانیت دو بڑے فریقوں میں بٹ چکی ہے۔ ناممکن تھا کہ اس عالمگیر مسئلے کی لہریں شاعرِ مشرق کے افق خیال پر وارد نہ ہوتیں۔ چنانچہ ہمیں ان کے کلام میں ان کے ردعمل کے نشانات جا بجا نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ روحِ لینن کی زبان میں خالقِ کائنات سے برملا یہ سوال کر دیتا ہے کہ ؎

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ زندہ و پائندہ تری ذات

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی؛
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ!
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اور کبھی خداوندِ ارض و سما کی زبان سے فرشتوں کو یہ حکم دلوایا ہے کہ ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ!
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یہاں یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اقبالؔ نے روح الامین کی زبان سے جو کچھ کہلوایا ہے وہ خدا کے حضور میں کہلوایا ہے جس کے وجود سے وہ اپنی ارضی زندگی میں منکر تھا۔ اور جس کی ہستی کا انکشاف اور حقیقتِ عظمیٰ کا احساس اسے اپنی ارضی زندگی کے بعد ہوتا ہے کہ ؎

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہے محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

برق و بخارات کے کمالات آج ان مقامات سے بھی بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ جن مقامات پر لینن نے انہیں چھوڑا تھا جو اس کی نظر میں سرمایہ دارانہ اندازِ معیشت کی مخلوق تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتراکیت نے سرمایہ داری کے زہر کا ایک جزوی اور وقتی تریاق ضرور پیش کیا۔ لیکن چونکہ اس کی بنیاد دار و گیر کی حکمت پر رکھی گئی تھی اس لیئے جہاں تک دولتِ دنیا کا تعلق ہے، اس نے اپنے اوجِ کمال پہ بھی فرد کو دینے کے قابل نہ بنایا۔ یعنی نااہل ہی رکھا۔ اقبالؔ کی نگاہِ حکیمانہ نے اس نکتے کو محصور کر لیا تھا۔ چنانچہ جہاں وہ وسائل دولت کو اللہ کی ملک قرار دیتا ہے وہاں وہ دولتِ فرد کا بہترین مصرف یہی سمجھتا ہے کہ وہ اسے الوہی صفات سے متصف کرتی ہوئی معاشرے کی نذر ہو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ بندۂ ناچار کو بندۂ مولا صفت کا اعزاز عطا کرتا اور زمین و آسمان کے خزانے اس کے تصرف میں دیتا۔ اور اس لیئے دیتا ہے کہ وہ اللہ کا امین بن کر اللہ کی دولت کو انسانیت کی فلاح و نجات کے راستے میں صرف کرے۔ اس ضمن میں اپنا مرکزِ نگاہ اور مثالی کردار آج کی دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی نگاہِ جویا، دیوانہ وار مشرق و مغرب کی وسعتیں طے کرتی اور ناکام لوٹ آتی ہے۔ لیکن آخر کار وہ تیرہ سو برس کا فاصلہ طے کر کے اس ذاتِ گرامی پہ تصدق ہو جاتی ہے جس کا نام بذل و ایثار کی تاریخ میں ابد الآباد تک روشن رہے گا۔ اور انسانیت کے سامنے صرفِ دولت کا ایک مثالی معیار ہمیشہ تک قائم

سکے گا۔ فرمایا کہ ؎

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحاب سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اٹھے
اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کے مال رسولِ خدا کے پاس
ایثار کی ہے دست مگر ابتدائے کار
پوچھا حضورِ سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ!
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار
کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار
اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

ملک یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضورؐ چاہیئے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوین روزگار
پروانے کو چراغ، عنادل کو پھول بس
صدیق رضؓ کے لئے ہے خدا کا رسول بس

اقبالؔ کا مثالی فرد پیکرِ ایثار ہونے کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کا سخت کوش بھی ہے کہ اس کی سخت کوشی ہی اسے اس درجے تک پہنچاتی ہے۔ جہاں وہ اپنے نتائج اکتساب کو انسانیت کی نذر کر سکتا ہے اور چونکہ سخت کوشی کسی ایسے معاشرے میں فروغ نہیں پا سکتی جو دولت کو دولت کی بنیاد بنائے۔ اس لئے بنیادی وسائل دولت کو اقبالؔ نے محض اللہ کی ملک قرار دیا ہے۔ انسان کو اس پر کوئی موروثی یا مستقل حق نہیں دیا۔ بلکہ اُسے تقسیم در تقسیم کے ذریعے پھر معاشرے کو واپس کر دیا ہے اور یہی عین حکمتِ اسلام ہے۔ اس نظریے کو حکیم الامت دولت کے سب سے بڑے خزانے یعنی زمین کی ملکیت کے ضمن میں یوں زیر نظر لائے ہیں۔

الارض للہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

اقبالؔ نے معیشت کا ایک نکھرا ہوا تصوّر ہمارے سامنے رکھا لیکن مقامِ حیرت و افسوس ہے کہ جس طرف دیکھو دارو گیر اور حرص و ہوا کا بازار گرم ہے۔ آج آپ کو اپنے گرد جتنے چہرے نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر کی پیشانیوں پر ھل من مزید کا عنوان خطِ بے نشاں میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔

آج اقبالؔ کے تصوّر مملکت میں قریب قریب ہر شخص ایک ہی دھن میں گم اور ایک ہی لگن میں مگن ملے گا۔ اور وہ دھن و لگن حصولِ زر اور تلاشِ دولت کے سوا اور قطعاً کچھ نہیں ہوگی۔

آج ہمارے بڑے بڑے کروڑ پتیوں سے لے کر معمولی درجے کے افراد تک کوئی شخص اس کی بے پناہ محبت سے بے نیاز اور اس کے

صحیح مصرف سے باخبر نہیں ہے۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ
دولت ایک بہتا ہوا پانی ہے اسے حوضوں میں بھر کر روک دیں تو تعفن
پیدا کر کے معاشرے کو بیمار کر دے گا۔ اور وہ چیز جسے عرف عام میں برکت
کہتے ہیں اس میں بخار بن کر اڑ جائے گا۔

اقبالؔ کا تصوّرِ معاشرت

(انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں یہ مقالہ پڑھا گیا)

اقبالؔ کی شاعری کو حسنِ انسانی اور حسنِ فطرت کے بعد جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حسنِ معاشرت کا ایک بلند اور مثالی تصوّر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شعرِ اقبالؔ میں ترتیب کے لحاظ سے اس کی نمود آخر میں ہوئی لیکن آغاز کے بعد اس کا فروغ، وسعت اور شدت دونوں کے اعتبار سے، شاعرِ مشرق کے کلام میں ایک بےمثال حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی قومی اور ملی شاعری کے تمام دوسرے پہلوؤں کو اپنی وسیع آغوش کے ایک گوشے میں چھپا لیتا ہے۔ آج اقبالؔ کی شاعری کی جن ممتاز خصوصیات کا سب سے زیادہ چرچا ہے اور جو شہرت کے پروں پر ہند سے نجد اور عجم سے فرنگ تک جا پہنچی ہیں۔ وہ مسلسل طور پر اس کی تعبیر خود داری ہے۔ لیکن غور کیجیے تو شاعر

کا یہ محبوب نظریہ جسے وہ کبھی فرد کے ارتقائے روحانی کی بنیاد، اور کبھی اقوام کے عروج و زوال کا محور قرار دیتا ہے۔ اس کے تصوّرِ معاشرت ہی کا ایک عنصر اور حسنِ معاشرت ہی کا ایک جمیل اور مثبت پہلو ہے۔ خواہ یہ معاشرت انفرادی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا ملی، جوارِ کعبہ میں فروغ پائے یا بت کدۂ ہند میں ——— لیکن اس نکتے کی طرف ہم آگے چل کر لوٹیں گے یہاں مجھے فقط اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ شعرِ اقبالؔ میں حسنِ معاشرت کی تفسیر کو نہ صرف ایک گراں قدر اہمیت حاصل ہے بلکہ آخر میں بھی ایک موضوع اس کی شاعری پر سر بسر چھا جاتا ہے۔ اور شاعر کے نطق سے لے کر اس کی الہامی کیفیات جذب و فکر تک سب پر محیط ہو جاتا ہے۔

اقبالؔ کے طالب علموں اور اس کے ناقدوں سے یہ امر مخفی نہیں، کہ اس کی شاعری کے دورِ اوّلیں ہی میں، حسنِ معاشرت کے متعلق اس کے تصوّرات کی تشکیل کا آغاز ہو چکا ہے۔ اقبالؔ کے ہاں کاکل و رخسار کی شاعری کا عنصر ویسے ہی بہت کم ہے۔ لیکن جب شاعر اپنے شباب ہی میں اس کوچے سے نکل کر فطرت کے بے بہار چمنستان میں چہل قدمی کر چکا اور ہمالہ کی سی عظیم المرتبت نظمیں بھی اس کے خامہ گلریز کی تراوش سے حیات جاوداں پا چکیں اور تصویرِ درد کی سی زندہ جاوید نظم میں وہ حبِ وطن کے زمزموں سے اہلِ وطن کے دلوں کو گرما چکا تو اس نے یک بیک اپنے آپ کو اس وادی میں پایا، جس کے ایک طرف سینا و فاران کی چوٹیاں تھیں اور دوسری جانب زندگی کا یمِ بے کراں، اور اس کے عین

درمیان ایک بے سروسامان قافلہ، جو سالار و حدی خوان کے بغیر راستہ ٹٹولتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اور یہاں وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر وہ دریا سے پار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اس غزل کی دوسری خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں محض اس کے اس امتیاز کو آپ کی توجہ کا مرکز بنانا چاہتا ہوں کہ شاعر اس کے فقط پانچ اشعار میں اپنی ملت کے نوجوانوں کے سامنے زندگی کے پانچ نئے نصب العین پیش کرتا ہے۔ ماحول کی تاریکی میں رہبری کا عزم، حوصلہ، مخالفت، حالات سے ستیزہ کاری و نبرد آزمائی، روایاتِ سلف کی تجدید، تہذیب جدید کی فضا میں فقر کا احیاء اور نفاذ، اور عالمِ انسانیت سے ایک بے پایاں محبت۔ ذرا غور فرمائیے تو یہی وہ عناصرِ خمسہ ہیں جو

آگے چل کر اس کی شاعری میں کہیں خودی کا فلسفہ بن کر رونما ہوئے، کہیں مومن کی شان میں جلوہ آرا نظر آئے، کہیں شاہین کی پرواز فلک سیر میں دکھائی دیئے اور کہیں فقر کی سربرآرائیوں اور محبت کی فتح مندیوں میں نگاہوں کو خیرگی عطا کرتے چلے گئے۔

اقبال کا کاروانِ سخن یہاں سے روانہ ہو کر اپنے سفر کی اوّلیں منزل میں متعدد مقامات پر ٹھہرتا ہے۔ لیکن ہر مقام پہلے مقام سے شاداب تر اور بلند تر ہے اور قطع سفر کے ساتھ ساتھ شاعر کا لہجہ ایک قطعیت، ایک راستی اور ایک دل کش وضاحت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ اب وہ قوم کے نوجوان سے اشارات و کنایات میں بات نہیں کرتا، بلکہ حالات کے تقاضے سے متاثر ہو کر براہِ راست خطاب کرتا ہے۔ اس کے ضمیر پر یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ قوم کا مستقبل اس کی نوجوان نسل کے ہاتھ میں ہے اور اس نسل کی بقا، اس کی سخت کوشی اور غیرت مندی ہی پر منحصر اور جادۂ حیات پر اس کی راست روی، شمعِ رسالت ہی کی ضو پاشیوں کی محتاج ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش
ز خاکِ تیرہ درون تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

نوجوانوں کو مشکل کشی اور جفا طلبی اور بست و شکست اور سوز و فشار میں ماضی کی یاد کا راستہ دکھاتے ہوئے وہ ذرا اور آگے بڑھتا ہے اور ماضی کے دھندلکوں میں سے انہیں تب و تابِ ملتِ عربی کا ایک منظر یوں دکھاتا ہے ۔۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیّارہ
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
غنی روزِ سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

حکیم امت نے اس نظم میں امت کے اسبابِ زوال میں سے ایک اہم سبب نوجوانوں کی اس سنجیدہ اور غیر ذمہ دارانہ روشِ زندگی کو بتایا ہے جس کی بدولت وہ نعمتِ لازوال جو ایک عظیم الشان ورثے کی صورت میں نہیں ملی تھی، ان کے ہاتھوں سے چھنتی چلی جا رہی ہے۔ اور وہ گرمیٔ عمل سے بے زار اور لذتِ گفتار میں اسیر ہو کر بیشتر انعام الٰہی سے بھی محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس نوع کا دلشگاف اور خیال انگیز طرزِ خطاب اقبال ہی سے خاص ہے اور اس خصوصیت نے اس کے حسن اور قوت کو کم نہیں کیا، بلکہ اور ابھارا ہے۔ اس نوع کی ایک اور نظم میں وہ طنز کی تلخی کو شعر کی حلاوت میں ملا کر اپنے مخاطب کو جو پھر نوجوان ہی ہے سوچنے پر یوں مجبور کرتے ہیں ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈھ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی

اسی انداز میں ایک اور جگہ یوں خطاب کیا ہے ؎

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ و رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری
تری خاک میں ہے اگر شرارہ تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسداللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

اقبالؔ کے کلامِ اوّلیں یعنی بانگِ درا کی آخری اور بالِ جبریل کی ابتدائی نظموں میں شاعر کے فکر کا اسلوب اور اس کے تصوّرات کا یہ مرکز ایک خاص حد تک واضح ہو گیا ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں اس دور کی معروف نظموں یعنی جوابِ شکوہ، طلوعِ اسلام اور خضرِ راہ میں سے متعدد ایسے مقامات آپ کے سامنے پیش کرتا، جن سے میری اس گزارش کی تائید ہوتی۔ لیکن اختصار کی ضرورت میرا دامن کھینچ رہی ہے اور میں فقط چار شعر اور پیش کر کے اس کی شاعری کے اگلے دور کی طرف پیش قدمی کروں گا۔ یہ اشعار اس زمانے کی یادگار ہیں، جب مسلمانانِ ہندوستان

کا ایک وفد مسئلہ خلافت پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان گیا تھا۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے | تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا | خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے | مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اگرچہ بظاہر ان اشعار کا زیادہ تعلق مسلمانوں کی سیاست سے ہے۔ معاشرت سے نہیں، لیکن دراصل شاعر ان سے نشتر کا کام لے کر اس کمزوری پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جو کمی غیرت، اور میلانِ سوال کی صورت میں اسلامیانِ ہند کے معاشرے میں پیدا ہو رہی تھی آگے چل کر اس کا یہ اندازِ فکر اور اس کے مخاطبین کا محلِ قبول واضح تر ہو جاتا ہے اور بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی بیشتر منظومات اس نوع کے مواقع اور خطابات سے معمور ہیں۔ میرا مقصود اس حوالے سے محض یہ بتانا ہے کہ فقر اور فقہ سے پیدا ہونے والی غیرت، خودی اور خودی سے پیدا ہونے والا اعتماد، ایمان اور ایمان سے پیدا ہونے والا ایقان، یہ وہ عناصر ہیں جو شعرِ اقبال اور اس کے موضوعات میں اس وقت بھی نشو و نما پا رہے تھے جب اس کی شاعری ابھی کاملاً ملی رنگ میں رنگی نہیں گئی تھی اور سخنوری کی سطح سے ابھر کر الہام کی رفعت سے

آشنا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے۔ جب شاعر کی بیشتر توجہ پہلے فرد کی سیرت کی تعمیر میں اور پھر اس سے بلند ہو کر قومی سیرت کی تشکیل میں صرف ہونے لگتی ہے۔ یہ اسرار و رموز کا زمانہ ہے اور یہ بات کس سے مخفی ہے کہ اسرار و رموز کی سرحدیں ایک مثالی اسلامی معاشرت کی پہنائیوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں تو فارسی میں پیام مشرق اور جاوید نامہ اور اردو میں بال جبریل اور ضرب کلیم کی وہ شاعری سامنے آتی ہے جس کا سب سے بڑا موضوع ملت اور اس کے مسائل ہیں۔ اور جیسا کہ میں آغاز میں عرض کیا تھا، ان مسائل کا سب سے گہرا تعلق ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی معاشرت، اس کی ممکنات اور اس کے مستقبل سے ہے۔ ان صحائف کے اوراق میں آپ کو اقبال کی رودِ سخن کے دو دھارے ساتھ ساتھ اسی طرح رواں نظر آئیں گے گویا دو مصفا نہریں ہیں کہ گنگا جمنا کی طرح ایک ہی پربت سے نکلی ہیں۔ اور پہلو بہ پہلو بہتی ہوئی ایک ہی سمندر میں جا ملیں گی۔ ایک دھارے کا نام خودی ہے اور دوسرے کا فقر اور دونوں کا امتزاج گویا دین و دنیا کی بادشاہی کا امتزاج ہے۔ خودی کے دھارے میں خودشناسی اور خدا شناسی کی موجیں کروٹیں لیتی ہیں۔ اور عرفان و ایمان کی سلسبیل دمکتی ہوئی چلی جاتی ہے اور فقر کا دھارا عشق و حمیت کی کوثر و تسنیم کو اپنے سینے سے لگائے سرود زندگی گاتا ہوا منزلِ ابد کی طرف رواں ہے۔ شعرِ اقبال کی یہ کیفیت دیدنی ہے، گفتنی و شنیدنی نہیں ہے

حب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

فقر کی تعریف بھی اس کے ہاں یہی ہے کہ فقر مفلس نہیں ہے بلکہ صرف سیر چشم ہے۔ وہ دولت کو باعثِ عزت نہیں سمجھتا۔ بلکہ دولت خود اس کے قدموں سے لگ کر عزت پاتی ہے۔ ملوکیت اور خلافت میں یہی ایک فرق ہے خدا کا نائب زمین پر آسمان کی بادشاہت قائم کرتا ہے۔ اور اسے محبت سے حیاتِ جاوید عطا کرتا ہے۔ اس کے برعکس زمین کا غاصب زمین کے عارضی اور جھوٹے منافع اور مصالح میں گم ہو کر بالآخر زمین ہی کا رزق بن جاتا ہے اور تاریخ عالم ایسی اقوام کی بد انجامی سے سرتاسر معمور ہے۔

اقبالؔ ایک ابھرتی ہوئی قوم کو معاشرت کا ایک متوازن نسخہ دینا چاہتا تھا کہ جب اس کی نجات اور سرفرازی کا وقت آئے تو وہ اس کے لئے ہر لحاظ سے تیار ہو غالباً یہی مصلحت آسمانی تھی کہ اس کے

ایامِ آخر کے کلام کا قریباً ہر ورق قوم کے لئے بیک وقت ایک نوید اور ایک انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے اور قدم قدم پر اسے حسنِ معاشرت کے مثالی نظام کی طرف بلاتا ہے ؎

نہ تاج و تخت میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات کہ مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالٰہ میں ہے
وہی جہاں ترا، تو جسے کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

پھر فرمایا کہ ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے
یہ عقل و دل ہیں شررِ شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے یہ نیستاں کے لئے

رہے گا وادیٔ نیل و فرات میں تا کے
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بے کراں کے لئے
نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

نوائے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

وہ مرغزار کہ بیمِ خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

پھر فرمایا کہ ؎

ہے یاد مجھے نکتۂ سلماں خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

گر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

معاشرت میں آزادروی، بلند فطری، جفاکوشی اور اکل حلال کے جو بلند تصوّراتِ اقبالؔ نے اپنے الہامی کلام کے آخری دور میں اپنی قوم کو عطا کئے، قوم نے ان کی یہ قدر کی کہ اس کی مثالی مملکت پر اقتدار پاتے ہی انہیں پارہ پارہ کر دیا۔ آج ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو حصولِ رزق میں شاہین کی بجائے کرگس کو اپنا رہنما نہیں بناتے؛ کتنے ہیں جو مراعات و وظائف کے حصول اور جائداد متروکہ کی تحصیل میں اپنی زندگی کی کامرانیاں تلاش نہیں کرتے؛ اور کتنے ہیں جو فقر، محبت ایمان، غیرت اور جفاکشی کے مسلک پر مہذب گداگری راحت طلبی اور مفت خوری کی زندگی کو ترجیح نہیں دیتے؛ اور یہیں تک بس نہیں، آج قومی پیمانے پر بھی غیروں کی بے تحاشا امداد لئے جاتے ہیں اور ہمارے چہروں پر حیا کی ہلکی سی سرخی بھی نہیں آتی۔ کیونکہ وہ مرد قلندر ہم میں سے بہت جلد اٹھ گیا۔ جس نے جاتے جاتے کہہ دیا تھا کہ ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

اقبالؔ کا تصوّرِ حسن

ایک جائزہ

اگرچہ آج تک یہ امر فیصلہ طلب رہا ہے کہ حسن دراصل ہے کیا چیز، اور اس کی اضافی حیثیت کیا ہے۔ اور اس بات کا بھی تصفیہ نہیں ہو سکا کہ حسن اور عشق میں اولیت کسے حاصل ہے، آیا حسن عشق کا پروردگار ہے یا محض اس کا ایک پرتو؟ محبت خوبصورتی سے جنم لیتی ہے یا خود اس کی تخلیق کرتی ہے؛ تاہم یہ مسائلِ فکر و دانش ہیں اور شاعری کی دنیا میں ہمیں ان کی آویزش کے مناظر تو نظر آتے ہیں۔ ان کا حکیمانہ تجزیہ قدرتاً نظر نہیں آتا۔ اقبالؔ ازبسکہ ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے فلسفی اور ایک عظیم مفکر بھی تھے (اور ابھی یہ بھی طے نہیں پایا کہ وہ زیادہ بڑے شاعر تھے یا زیادہ بڑے مفکر) اس لئے اقبالؔ کے کلام میں حسن کا مطالعہ ایک نہایت دلچسپ کیفیات

رکھتا ہے۔ آج کی صحبت میں اس کیفیت کا ایک ہلکا سا مشاہدہ مطلوب ہے۔

یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ شباب اور حسن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شباب نہ صرف حسن کو فروغ دیتا بلکہ اس سے شدید طور پر متاثر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی کم و بیش ایک کلیے کی سی حیثیت رکھتا ہے کہ کائنات کے تمام ظواہر حسن میں سے جنسِ مقابل کا جمال انسان کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ شاعر اس بارے میں اپنے بنی نوع سے کسی مختلف ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ عام افراد سے زیادہ حساس ہونے کے باعث اپنے احساس جمال اور اظہار تاثر دونوں میں اوروں کی نسبت زیادہ شدت اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ شباب کی شاعری سے منسوب ہے اور خود شعر شباب جس شمع کے گرد پروانہ وار گھومتا ہے اس کا نام عورت ہے ـــــ پھر مشرق میں شعر کا یہ میلان مغرب کی بہ نسبت یوں بھی بہت نمایاں ہے۔ اور عرب کی شاعری ہو یا عجم کی، سرود بنگالہ ہو یا حدیثِ بادیہ، اس کی سوز و سرود کم و بیش وہی کیفیتیں پائی جاتی ہیں جنہیں کسی لیلی یا شیریں کا جمال تخلیق کرتا یا کسی ہیر یا رادھا کا جذب معرضِ وجود اظہار میں لاتا۔

ہماری زبان کی شاعری نے بھی قریب قریب وہی روایات ورثے میں پائی ہیں، جن سے فارسی، عربی یا خود اس ملک کی مختلف زبانوں کی ادبیات معمور تھیں۔ ہم نے روایات کے اس سرمائے کو نہ صرف

محفوظ رکھا ہے بلکہ اس میں خوب و ناخوب، دونوں قسم کے اضافے بھی کئے ہیں۔ غزل اور مثنوی قصیدہ اور مرثیہ واسوخت اور دیگر اصنافِ سخن کا دامن ہمارے شعرا کے خونِ دل و جگر سے رنگین ہے۔ انہوں نے روایتی اور غیر روایتی دونوں قسم کے محبوبوں کے جمالِ جہاں آرا کی خوب خوب مدح سرائی کی ہے۔ اور بیانِ حسن میں بے شمار جدتوں اور بے حساب نکات و نوادر سے اپنے سخن کی تزئین فرمائی ہے۔

اقبال کو بھی یہی روایات ورثے میں ملی تھیں اور اپنی جوانی کے آغاز میں جب اس نے شاعری سے رسم و راہ پیدا کی تو اردو کی محفل میں داغ و امیر کا طوطی بول رہا تھا۔ اور انہیں کا رنگ سخن اور انہی کا اندازِ فکر ہماری شاعری پر چھا رہا تھا۔ قدرتی طور پر نوجوان شاعر ایک لمحے کے لئے رکا مگر تاثر و اظہار کے اس طریقۂ راسخہ سے محض صاحب سلامت کرتا ہوا فوراً آگے بڑھ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ امیر کے بعض عارفانہ اشعار اور داغ کی عاشقانہ معاملہ بندی نے اسے وقتی طور پر متاثر کیا۔ اور وہ ایک دقیقۂ سرخوشی میں پکار بھی اٹھا کہ ؎

عجیب شے ہے صنم خانہ امیر اقبال
میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

اور داغ کی وفات پر یہ شکوہ کئے بغیر نہ رہا کہ ؎

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

لیکن حسن اور حسن پرستی کا یہ تصوّر و تاثر محض ایک کیفیتِ گزراں رکھتا تھا۔ اُس کے قلب و ذہن کی واردات نو بہ نو کا عکاس نہیں تھا۔ اقبالؔ کے شباب کا ایک نہایت تاثر پذیر حصّہ بلادِ مغرب میں بسر ہوا لیکن حیرت ہے کہ ہمیں اُس کے اُس زمانے کے کلام میں اُس طوفانِ جمال کا کوئی سراغ نہیں ملتا، جس کا اس نے یورپ کے حسین ترین خطوں میں سامنا کیا۔ حسن نسوانی اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کے سامنے جلوہ آرا تھا، اور اس حسن کے عناصر میں فقط خط و خال اور گیسو و رخسار ہی شامل نہیں تھے، بلکہ وہ تمام ذہنی اور تہذیبی دلکشیاں بھی موجود تھیں جو حسن کو چمکاتی اور دل ربائی کو چار چاند لگاتی ہیں۔ لیکن شاعرِ مشرق نے اس سیلابِ رنگ و بو میں اپنا سر دامن بھی تر نہ کیا اور صنم خانۂ مجاز سے یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا کہ ؎

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلےٰ بے کار!
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا
سب کو محوِ رُخِ سعدیٰ و سلیمےٰ کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں

اقبالؔ کا عبدالقادر کے نام یہ پیغام بظاہر ایک پیامِ دوست بنامِ دوست ہے لیکن حقیقت میں یہ وہ سنگِ میل ہے، جہاں سے

اس کا قافلۂ شعر راہ و رسمِ منزلہا کو ترک کر کے کائناتی وسعتوں میں داخل ہوتا اور کعبۂ عرفاں کو اپنی منزل گہہ مقصود ٹھہراتا ہے۔ اور یہیں سے اس کی نوائے پریشاں رسمی شاعری کی تنگنائے سے نکل کر اُس فضائے بسیط میں وارد ہو جاتی ہے جس کا ایک نام عشق و مستی ہے اور دوسرا ایمان و ایقان۔ لیکن شاعر کے ذہنی اور روحانی افق کی یہ توسیع بے نہایت اس امر کی طالب تھی کہ اس کے تمام تر تصوّراتِ معروضی میں بھی ایک انقلاب برپا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تصوّرات نہایت سرعت کے ساتھ ایک عالمگیر پہنائی و گہرائی اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ شاعر کا تصوّرِ حسن و جمال بھی انہیں میں سے ایک تصوّر ہے۔

پس یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس فروغِ عام سے محروم رہ جاتا جو شاعر کے فکرِ فلک رس اور احساسِ بے قیاس کو عطا ہو رہا تھا اور اس شمع سے کسبِ ضیا نہ کرتا، جو اس کے نہاں خانۂ دل میں روشن ہو چکی تھی اور جس کی روشنی میں وہ فکر و نظر کے نوادر و جواہر تلاش کرتا اور سرایہ پاتا چلا جا رہا تھا۔

اقبالؔ کے کسی طالب علم کو شاعر کے تصوّرِ حسن میں ارتقاء کی جو چند منازل صاف صاف نظر آ جاتی ہیں۔ ان میں پہلی منزل لاریب حسنِ نسوانی کی وہ مختصر منزل ہے جسے شاعر کا ادراک و احساس اور فکر و فہم ایک ہی پرواز میں طے کر جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بوستانِ ہستی کی یہ بہار کہ بہارِ ناز ہے، دیدنی بھی اور محبرِ زندگانی کا یہ شعلہ کہ شعلۂ رُخِ زیبائے نگار

ہے۔ در حورا عتنائے پروانہ تھا۔ لیکن تقدیرِ الٰہی کے تقاضے اور سروشِ غیب کی بے تابیاں شاعرِ فردا کا دامن بے طرح کھینچ رہی تھیں۔ اور اُسے نگارستانِ حسن کے تماشے کے لئے فرصتِ یک نظر بھی دینے کی روادار نہیں تھیں۔۔

چنانچہ کوئے عشق و رسوائی میں اُسے وہ استقلال و مقام نصیب نہ ہوا جو ہمارے شعرائے عظام کا مقامِ امتیاز تھا اور جس کوچے میں میرؔ ہر بہانے صبح و شام اور دن سے رات کیا کرتے تھے، اقبالؔ اس میں سے نسیم بہار کے ایک جھونکے کی طرح نکل گیا۔ اور اپنے پیچھے اگر اس نے کچھ چھوڑا تو وہ ایک غبارِ نور تھا جس سے اس کی غزلیہ اور عشقیہ شاعری کی فضا ابد تک روشن رہے گی۔

یہ ایک قابلِ غور بات ہے کہ اقبالؔ خدا کے بعد صرف نور کا پرستار ہے۔ بلکہ اُس حسنِ مطلق کو بھی، کہ خدا جس کا نام ہے، اکثر و بیشتر نور ہی کے لباس میں جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اس کی کائنات پر بھی سر بسر ایک فضائے نور محیط ہے۔ اور اس کی شاعری کا دامن بھی آفتاب سے لے کر جگنو تک اور شمع سے لے کر گلِ لالہ تک، نور ہی کے عظیم و صغیر مظاہر سے مالا مال اور مستنیر ہے چنانچہ جب وہ اپنے شعر میں حسنِ نسوانی کو بار دیتا ہے، تب بھی اس کی توجہ اس کے پہلوئے طلعت و نور ہی پر مبذول ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جس کی نمود دیکھی، چشمِ ستارہ بیں نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدے میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں

جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے، حسینہ، تیری کمال اس کا

آپ نے دیکھا شاعر کو اسی نور کی جستجو ہے جو بیک وقت اس کا منتہائے نظر بھی ہے اور مظہر جمال بھی، اور جب وہ خورشید و ماہ کی انجمن اور ستاروں کی محفل سے ہوتا ہوا کاشانۂ محبوب تک آن پہنچتا ہے تو وہاں بھی حسنِ مطلق کی تلاش اُسے محبوبہ کی آنکھوں ہی تک لے جاتی ہے کہ آنکھیں ہی بیک وقت مصدر نور بھی ہیں اور مرکز نور بھی۔ نور یہاں وارد بھی ہوتا ہے اور یہاں سے صادر بھی کیا جاتا ہے اور اس جگہ یہ نکتہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ حسن اپنی نمود کے لئے جس وسیلے کا سب سے زیادہ محتاج ہے وہ چشم تماشا اور اس کا نور ہی تو ہے، اگرچہ وہ خود بھی اپنے لطیف ترین اظہار کے لئے نور اور اس کے جمیل ترین مظہر یعنی چشم محبوب ہی کی صورت اختیار کرتا اور اپنے مقصدِ جذب و کشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اقبالؔ کے ہاں جمالِ نسوانی، شاعر کے سلسلۂ حسن کا محض ایک حلقہ ہے اور وہ بھی آخری، اور اگرچہ یہ اپنی دل آویزی

میں بعض دفعہ دوسرے حلقوں پر سبقت بھی لے جاتا ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ شاعر کی نگاہِ انتخاب فطرت کے حسنِ لازوال کے مظاہر بے شمار کا بار بار جائزہ لیتی، ان سے بار بار متمتع ہوتی اور اپنے اس سفرِ جمیل میں بالآخر حسنِ نسوانی کے کسی مظہر کمال پر بھی ایک لمحہ بھر کے لئے آن رکتی ہے۔ لیکن وہ یہیں کی نہیں ہو رہتی۔ اُسے اور منازل بھی درپیش ہیں۔ اسے اور مراحل بھی طے کرنے ہیں۔ دیکھئے، کشمیر جنت نظیر کا ایک مرقع بے مثال کہ جس کے نظارے میں شاعر اپنے ناظر کو یوں شریک کرتا ہے ؎

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج
صلصل سار زوج زوج، بر سرِ نارون نگر
تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز
بستہ بہ چہرۂ زمین برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بر دمید، موج بہ آبجو تپید
خاک شرر شرر ببیں، آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تارِ ساز زن بادہ بہ ساتگین بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر
دخترکے برہمنے لالہ رخ سمن برے
چشم بروے او کشا باز بہ خویشتن نگر

دیکھئے! برہمن کی دخترِ لالہ رخ کو شاعر کی نگاہِ توجہ کا ایک شمّہ ملتا تو ہے، لیکن سب سے آخر میں، وہ اس کے منصوبۂ حسن میں شامل تو ہے مگر اس پر حاوی نہیں ہے۔ اور شاعر کائنات کے دیگر مظاہر حسن کی طرح اُس پر بھی نظرے خوش گزرے، ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے، اس کے کیفِ جمال میں مخمور نہیں ہو جاتا۔ اپنے اس اندازِ خیال ونظر کا شاعر کو خود بھی احساس ہے۔ اور اس درجہ احساس ہے کہ وہ اپنے کلام میں جا بجا اس کا اظہار کرتا ہے۔ اور بعض دفعہ اس کی تفصیل وتشریح پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُسے یہ ضرورت مذاق زمانہ کے خلاف اور اپنے ذہنی تقاضوں کے مطابق چلنے کے باعث محسوس ہوتی ہے۔ اس کا افقِ ادراک واحساس ایک غیر معمولی رفتار سے وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے ناظر کو بھی اس کی وسعتوں اور پہنائیوں میں اپنا رفیق سفر بنالے اس خیال کو ایک نہایت لطیف مکالمے کی صورت میں اس نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے ؎

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؔ تو
رونقِ ہنگامہ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
جانبِ منزل رواں ہے نقش پا مانند موج
اور پھر افتادہ مثلِ ساحلِ دریا بھی ہے
حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنن پہ مدار
تو کبھی ایک آستانے پہ جبیں فرسا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب
اے تلون کیش تو مشہور بھی، رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے ہے عجب بے تاب تو

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
ہیں ہزاروں اس کے پہلو، رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں، دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں
گو حسینِ تازہ ہر لحظہ ہے مقصودِ نظر
حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں
موجبِ تسکیں تماشائے شرارِ جستہ
ہو نہیں سکتا کہ دل برق آشنا رکھتا ہوں میں
جستجوِ کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے دردِ لا دوا رکھتا ہوں میں

یہاں سے ہم تصوّرِ حسن کی دوسری منزل میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ منزل، جیسا کہ شاعر نے خود اشارہ کیا ہے۔ جمالِ کائنات کی منزل ہے اور یہاں وہ اپنے دردِ لادوا یعنی جستجوئے حسن سے مجبور ہو کر، بے حساب کوچہ ہائے جمال میں سے گردش کرتا ہوا وارد ہوتا اور پہلی مرتبہ ایک تسکین یافت سے آشنا ہوتا ہے۔ اس احساس کو اُس نے اپنی متعدد نظموں اور بے شمار اشعار میں بیان کیا ہے اور ہر بار اپنے مخاطب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے، اجزا سے کل کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ اور اسے حسنِ کامل کے الماس ہزار پہلو کی بے شمار اطراف دکھائی ہیں۔ یہاں یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ شاعر کا یہ اندازِ فکر و احساس اُس کی شاعری کے اولین دور ہی میں ظاہر ہو کر اسی دور میں خاصی ترقی بھی کر چکا تھا۔ یہ ترقی اس کی رفتارِ عمر اور فروغِ فن کے ساتھ برابر جاری رہی۔ یہاں تک کہ وہ سنگِ میل بھی آن پہنچا جب وہ اہلِ فن کی روش عام سے بے زار ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

پھر یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حسن کے عالمگیر جائزے میں اقبالؔ کا تصوّرِ حسن، منجمد یا متعین مظاہرِ حسن ہی سے نسبت نہیں رکھتا بلکہ وہ اشیا و صور کی بہ نسبت کیفیات سے زیادہ متاثر ہوتا اور اس طرح اپنی نمود کے لئے ایک لطیف ترجامہ پہن لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ کا ذوقِ جمال اپنی بالاتر منازل میں اجسام

جمیل کی بجائے کیفیاتِ جمیل تر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور ان سے ہم آہنگی اختیار کر کے اس کے فن کو احساس و اظہار کی بلند ترین چوٹیوں پہنچا دیتا ہے۔ اسی میلانِ رفیع میں اُس کی شاعری کی عظمت پنہاں ہے۔

اس میلان کا آغاز بھی اگرچہ شاعر کے نمودِ فن کے اولین دور ہی میں ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اپنی حقیقی بلندیوں تک اُس کی شاعری کے دورِ وسطیٰ یا بالفاظِ دیگر بالِ جبریل کے دور میں پہنچا۔ یہ دور جیسا کہ ناظرین جانتے ہیں، شعرِ اقبال کا دورِ حسن و جمال ہے اور اس عہد میں شاعر نہ صرف احساسِ حسن بلکہ بیانِ حسن میں بھی اپنے اوجِ کمال پر نظر آتا ہے، اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اس کے اس دور کی زیادہ رفیع تخلیقات بھی حسنِ صورت کی بہ نسبت حسنِ کیف سے زیادہ متاثر و معمور دکھائی دیتی ہیں۔

یہاں مناسب تھا کہ میں اس یاقوتِ عزیز کے چند نوادر بطورِ مثال آپ کی خدمت میں پیش کرتا لیکن شاید یہ انسب ہو کہ ہم چلتے چلتے ایک سرسری نگاہ اس جادۂ تابناک پر بھی ڈالتے چلیں جس پر اقبال کا قافلۂ شعر بلوغت و پختگی کے فرسخ و میل طے کرتا اور بانگِ درا کی لرزشوں سے نکلتا ہوا بالِ جبریل کے خنک سایوں میں وارد ہوا۔ جب یہ قافلہ رواں ہوا تھا تو بوستانِ فطرت میں شاعر خوشنوا کی لے کا انداز کچھ اس طرح کا تھا ؎

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

ظاہر ہے کہ تصویر خانۂ فطرت کے یہ چند مرقعے شاعر کے اولین احساسِ حسن کے آئینہ دار ہیں۔ غالباً اسی لئے ان میں حسنِ کیفیت کی بہ نسبت حسنِ صورت زیادہ نمایاں ہے۔ اگرچہ اس سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ احساسِ لطافت و ذوقِ جمال کے اعتبار سے ان کی سطح بھی بغایت درجہ بلند ہے۔ لیکن اب ذرا صورت سے کیف کی طرف چلئے اور اسی دور کی چند منظومات میں حسنِ کیف کی چند واردات بھی محسوس فرما لیجئے۔

ہمالہ

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلئے شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ سیاہ
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا
داغ جس میں غازہ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو
شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منار خواب گہ شہسوار چغتائی

فسانۂ ستم انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

قطع نظر اس امر کے کہ کیفِ حسن، صورت حسن سے، کیا بلحاظ احساس پذیری اور کیا باعتبار لطافت آفرینی، منزلوں آگے ہے، آپ نے یہ بھی دیکھا کہ شاعر ایک لمحۂ انبساط و خود فراموشی میں خود اس کے اندر گم ہو جاتا ہے اور اس جہانِ وجد و جذب کو جو اس کے سینے میں آباد ہے، اس جہانِ رنگ و بو سے اس طرح پیوست کر دیتا ہے کہ حسن اور پذیرائی حسن میں کوئی حدِ فاصل نہیں رہتی۔ اور تماشا اور تماشائی ایک ہی سیلابِ کیف میں بہہ کر ابد کے کناروں کو چھو آتے ہیں۔ شعر اقبال کی یہ وجدانی کیفیت اگرچہ اس کے سراپائے سخن میں شروع سے جاری و ساری ہے اور آخر تک برابر رواں دواں رہتی ہے۔ لیکن اقبال کا شعرِ شباب بالخصوص اس روح جمال سے سرتاسر معمور ہے اور کیفِ حسن کے بے حساب جواہر و نوادر اس کے دامن میں درخشاں و فرزاں نظر آتے ہیں۔ وقت اور گنجائش کی کمی کے باعث ہم ان کی بے شمار

مثالوں کو نظر انداز کر کے بانگِ درا کی ایک آخری نظم کے محض چند اشعار پیش کریں گے اور آگے بڑھ جائیں گے۔

خضرِ راہ کا پہلا بند

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے، جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

کلامِ اقبال کی وسعتوں میں اس انداز کے جہالستان کثرت سے نظر افروزِ طالب اور دامن کش دل ہیں۔ اور ان کی سب سے بڑی خوبی

یہ ہے کہ شاعر ان کی چمن بندی قصداً نہیں کرتا بلکہ اپنی جستجوئے حقیقت اور تلاش زندگی میں انہیں یہ سہ راہ کھلا تا چلا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس بھی بدیہی طور پر اس حقیقت کا غماز اور اس صداقت کا شاہد ہے اور یہاں سے ہمیں تلازمۂ خیال اسی نوع کی ان تخلیقات تک لے آتا ہے جو بالِ جبریل کی زینت اور شاعر کے تصورِ جمال کی منزلِ وسطیٰ کی آئینہ دار ہیں۔

اس منزل میں شعرِ اقبال کی پختگی اگر کوئی حریف رکھتی ہے تو وہ اس کی حسن کاری اور حسن شناسی ہے۔ شاعر نے اس منزل میں پہنچ کر حسن سے اپنی وابستگی کی کسی شعوری اور بدیہی کوشش کا اظہار نہیں کیا لیکن اس دور کی قریب قریب ہر تخلیق نہ صرف اس کے احساسِ جمال کا ایک شدید ثبوت مہیا کرتی ہے بلکہ بسا اوقات خود خالقِ جمال کی حیثیت بھی اختیار کر لیتی اور حسن کے جلوہ ہائے نو بہ نو کو کتمِ عدم سے معرضِ وجود میں لاتی چلی جاتی ہے۔ بالِ جبریل کی متعدد منظومات جمالِ کائنات کے نہایت روشن نقوش اور نہایت دل آویز تصاویر پیش کرتی ہیں اور فنی طور پر ان کا شمار دنیا کی اول درجے کی شاعری میں ہوتا ہے۔ امتیازی خوبیاں ان کی بھی وہی ہیں جو شاعر کے ادبیں نقوشِ جمال سے خاص ہیں یعنی حسنِ صورت کی پرستش کی بجائے کیفِ جمال کی والہانہ تخلیق اور موضوعِ جمال کی طرف بے غرضانہ پیش قدمی۔ فرق صرف پیشکش کی پختگی اور تخئیل کی پرواز اور اس دقتِ نظر کا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور توسیعِ علم و احساس کے ساتھ فروغ پاتی چلی گئی ہے۔ یہ سہ

اس دورِ حسن افروز کی ایک آدھ مثال

ذوق و شوق

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ، نرم ہے مثلِ پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

بیسیوں برس ہوئے جب شاعر کنارِ راوی پر کھڑے اپنے آپ میں گم ہو گیا تھا۔ گردشِ زمانہ آج سے پھر ایک بار کنارِ دریا لے آئی۔ اب کے یہ دریا خاکِ پاک پنجاب کی بجائے اندلس کی کسی حسین و خواب انگیز وادی میں بہہ رہا ہے۔ لیکن شاعر کے احساسِ جمال میں کوئی کمی نہیں آئی کچھ بختگی ہی پیدا ہوئی ہے۔ دیکھیے ۔۔۔۔

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب!
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نَو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

یہاں پہنچ کر شاعر کے طالب علم کو یہ نکتہ بھی ارزانی ہوتا ہے کہ حسن نہ صرف شاعر کے ذوقِ جمال کی تسکین کرتا ہے بلکہ اس کے فکرِ حکیمانہ کو بھی ابھارتا اور فروغ دیتا ہے اور یہ کیفیت کم از کم ہمارے ہاں اقبال ہی سے خاص ہے۔ نظارۂ جمال کے عین بعد شاعر کا گریز اسے جذبہ و احساس کی وادیٔ رنگین سے اٹھا کر فکر کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ جہاں سے وہ اس جہانِ گزراں کی گوناگوں کیفیتوں پر ایک نظرِ حکیمانہ ڈالتا اور اپنے اس مشاہدہ کے نتائج سے اپنے فکر میں کشادگی، اپنے تخیل میں پرواز اور اپنی پرواز میں قوت پیدا کرتا ہے۔ حسن کی خیال افروزی اور فکر انگیزی کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

ایک اور کیفیت، جو ہماری زبان کی شاعری میں شعرِ دلکش اقبال ہی سے خاص ہے، ان نظریاتِ حسن کی پیش کش ہے جو شاعر کے ذہن میں وقت کی رفتار کے ساتھ ابھرتے اور تربیت پاتے رہے۔ ان کا مطالعہ اقبال کے طالب علم کے لئے بجائے خود ایک مستقل مطالعہ ہے کہ یہ اس کی شاعری کے بہت سے ایوانوں کے دروازے کھولتا ہے اور اس کے طالب علم کو اس کی روحانی خلوتوں میں جھانکنے کے بے مثال مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہاں پر ان کا ایک سرسری ذکر بھی طوالت کا موجب ہوگا۔ تاہم حسن سے اس کی اس آشنائی پر ایک نگاہِ گزراں ڈالنے سے مفر بھی ممکن نہیں۔ آپ کو اس کی وہ حسن افروز نظم ضرور یاد ہوگی جس کا مصرعِ اولیں یہ ہے ع

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

بظاہر یہ حسنِ قدرت کا ایک دلکش بیان اور حسینانِ فطرت کا ایک دل آویز مرقع ہے لیکن غور کیجئے تو اس کی روح اس کا آخری شعر ہے، جو حسنِ مطلق کی بے نیازی کو معرضِ اظہار میں لاتا ہے۔ دیکھئے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پرواکو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

کچھ یہی انداز شاعر نے بانگِ درا کی ایک دل آویز نظم "ستارہ" میں اختیار کیا ہے اور حسن کی خصوصیت زوال پذیری کو ستارے سے اپنے خطاب میں یوں برآمد کیا ہے ؎

قمر کا خوف کہ خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو

متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراس فنا صورتِ شرر تجھ کو

زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھ کو

غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
چمکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس میں کچھ شک نہیں کہ اس خطاب سے شاعر کا مقصود موجودات عالم کی تغیر پذیری اور فنا و بقا کے ربط باہم کو نمایاں کرنا تھا، لیکن ازبسکہ خزینۂ کائنات کا سب سے قیمتی سرمایہ اور سب سے دل آویز گوہر حسن ہے اس لئے اس کا تغیر و زوال پذیر ہونا فطرتاً دلِ شاعر پر تمام تغیرات سے زیادہ شاق گزرتا ہے اور وہ بظاہر ستارے سے خطاب کرکے دراصل خود اپنے دل کو یہ تسلی دیتا ہے کہ حسن و جمال اور زوال و فنا کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور حسن کے عناصر ترکیب میں زوال ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خیال کو اس نے اپنی ایک اور دلفریب نظم میں یوں بیان کیا ہے ؎

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خوں ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

حسن کی فطری بے پروائی اور بنیادی زوال پذیری کے بعد اس کی تیسری خصوصیت جو شاعر کے ضمیر پر روشن ہوئی وہ اس کی شانِ مقصودیت سے محرومی ہے۔ اقبال کے نزدیک حسن انسان کا مقصودِ ظاہر تو ہے لیکن مقصودِ آخر نہیں ہے۔ یہ شرف اس نے خود طالب ہی کے لئے مخصوص رکھا ہے۔ وہ اپنے کلام میں بار بار اس حقیقتِ عظمےٰ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہر چند یہ کائنات حسن سے معمور ہے لیکن چونکہ اس کی خلاق خود اس کے طالب کی نگاہ ہے اس لئے چشمِ جویائے جمال، نظارۂ حسن سے سیر ہو کر بھی محرومِ تسکین رہتی ہے۔ طالب کی تشنگی کو نہ چشمِ سلیمیٰ کا آبِ حیات بجھا سکتا ہے نہ چشمۂ آفتاب کا سیلِ نور اس کے لئے اگر کوئی نویدِ راحت ہے تو وہ خود اس کے اپنے سینے کے اندر ایک دھیمی سی صدا کی صورت میں اٹھتی ہے اور اسے زمزمۂ کامرانی سناتی ہوئی ابد کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ شعرِ اقبال کے دامن میں اس صداقت کے بے شمار شواہد آسمانِ شب کے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ دیکھئے ؎

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری شب کی سیاہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلک ناآشنا کی کوشش گفتار میں
ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

تلاش کی بے تابی ظاہر ہے کہ جویائے جمال کو پایانِ کار اپنی ذات ہی کی طرف مائل کرتی ہے اور اگر اس کی جستجو میں خلوص، اس کی نگاہ میں گہرائی اور اس کے عزم میں صلابت ہے تو وہ بالآخر اپنے آپ کو پالیتا ہے اور

حسنِ مطلق سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ یافت کی یہ کیفیت مرشد اقبال رومی کے ہاں بھی بدرجۂ کمال موجود ہے اور اگر فکر کے اس خاص پہلو میں اقبال نے کوئی اکتساب کیا ہے تو رومی ہی سے کیا ہے۔ لیکن اس نظریے کی ابتدا اس کے دورِ اولین ہی سے ہو چکی تھی اور یہ حکم لگانا محلِ نظر ہے کہ اس کے فروغ میں مرشدِ روم کے اثرات ایک بہرۂ وافر رکھتے ہیں۔ بہر نوع کلامِ اقبال میں اس نظریے کی دل آویز مثالیں بار بار ملتی ہیں اور فکرِ ناظر کو مہمیز لگا جاتی ہیں ؎

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش پا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی کوہکن بھی ہے

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں!
کہ لیلےٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

اقبالؔ کے تصوّرات حسن و جمال کا شمار ابھی بہت باقی ہے لیکن اس مقالے کی اغراض کے لئے اب ہم اس کے آخری تصوّر حسن سے ایک نگاہِ ناآشنا ملا کر آپ سے رخصت چاہیں گے یہ اس کی پختگیٔ فکر کے کرشموں میں سے ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اس کے نظریۂ قوت و استقلال کا ایک مظہر ناتمام ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا آخری دور نتائج کا دور تھا۔ وہ اس دور میں بڑی سرعت کے ساتھ اپنے افکار و محسوسات کے نتائج مرتب کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس دور میں اس کی شاعری وہ کیفیت بھی اختیار کر چکی ہے جو اجزائے پیمبری میں شمار ہوتی ہے۔ اور اسی کیفیت کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کی تمام تر توجہ اپنی ملت کے نوجوانوں پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی کہ انہی کو مستقبل قریب میں ایک کار عظیم سرانجام دینا اور ایک مقصد جلیل حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ حکیم مشرق نے جو نسخۂ عمل اس مہتم بالشان مہم میں ان کی کامیابی کے لئے تجویز کیا اور جسے اس کی زندگی بھر کے فکر و تفکر کا حاصل کہنا چاہیئے۔ وہ تمام تر قوت و استقلال کے عناصر

گراں قدر پر مشتمل تھا۔ اور انہی عناصر میں وہ عنصر لطیف بھی شامل تھا جسے شاعر مشرق کا آخری تصور جمال کہنا چاہیئے۔ شاعر کے اس نئے نظریے میں قوت وجلال، حسن وجمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور نوجوانِ فردا کے احساسِ جمال کو ایک نئی کیفیت اور ایک نئی زندگی عطا کرتے ہیں۔ مغرب کی سب سے بڑی شاعرہ یعنی یونان کی ساحرہ سیفو نے آج سے کم وبیش تین ہزار برس پہلے کہا تھا کہ ؎

خوب ہے جو حسیں ہوا، بت ہوا نازنیں ہوا
جو نہ حسیں ہوا، مگر، خوب ہوا حسیں ہوا

اقبال نے خوبی کو طاقت سے بدل کر سیفو کے تین ہزار برس بعد ایک ابھرنے والی قوم کو حسن کا ایک نیا تصور دیا۔ رعنائی قوت اور زیبائی استقلال کا تصور۔ اور اسے عطا کرتے وقت شاعر کی یہ آرزو تھی کہ فردا کا نوجوان حسن کے آبگینے میں جلال کا رخِ زیبا دیکھے اور اپنے احساسِ جمال کو نظارۂ جلال سے تسکینِ تام دینے پر قادر ہو جائے کہ یہی آنے والے دور کا پیغام اور یہی اس کے مقدر کا تقاضا تھا۔

فرمایا کہ ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن وزیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا

پھر فرمایا کہ ؎

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

یہ آبجو کی روانی، یہ ہمکناریٔ خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ

اُدھر نہ دیکھ، اِدھر دیکھ اے جوانِ عزیز
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

فوارے کا زورِ دروں آبِ جو کی نرمیٔ رفتار سے ایک نسبت بعید تو رکھتا ہے لیکن شاعر اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے، اور جوانِ خرد کے لئے تابِ شمشیر کو تابِ حسن کی معراج قرار دیتا ہے۔

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دل کشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکیٔ شمشیر

شعرِ اقبالؔ میں حسن کا یہ جدید تصور آخر میں متشکل ہو کر مردِ مومن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور از بسکہ جمال، حسن تناسب ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے اقبالؔ کی ان دونوں تخلیقات میں حسن تناسب اور جمال پرواز کا مطالعہ بجائے خود ایک مستقل اور دلچسپ کیفیت کا مطالعہ ہے۔

ہمارے موجودہ مقالے کی حدود میں اس کیفیت سے بہرہ اندوز ہونا شاید ممکن نہ ہو۔ اس لئے اسے کسی اور صحبت پر ملتوی کرنا ہوگا لیکن چلتے چلتے ایک قطعہ بے عدیل کہ شاعر کے دورِ اوّلیں کی یادگار ہے، اور اپنی پیش کش کے لئے ہمارا دامن بے طرح کھینچ رہا ہے۔ ضرور سن لیجیے۔ فرمایا کہ ؎

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنّا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں سحاب

ابدی بنتا ہے یہ عالم فانی جس سے
ایک افسانہ رنگیں ہے جوانی جس سے

جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا
منظرِ عالمِ حاضر سے گریزاں ہونا

دور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے
عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے

آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں
خاتم دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

اور اب سوچیے کہ مشرق کے اس شاعر کبیر نے حسن و جمال کے جتنے تصوّرات ہمیں دیئے کیا وہ بالآخر اسی انجام کو پہنچنے والے تھے ؟

اقبالؔ کا نظریۂ خودی

آپ یہ سن چکے ہیں کہ اقبالؔ کا نظریہ خودی درحقیقت عظمتِ آدم کی شناخت کا دوسرا نام ہے۔ یہ قرآنِ حکیم کی اس تعلیم پر مبنی ہے کہ انسان ہی خلاصۂ کائنات ہے اور یہ کائنات اسی کے لیے خلق کی گئی ہے یوں تو بیشتر عناصرِ قدرت اور مظاہرِ قدرت کو روزِ اول سے اس کے تابع کر دیا گیا تھا لیکن جن قوتوں نے شروع میں اس کی برتری کو تسلیم نہ کیا ان سے متواتر جنگ و تنازع اس کی زندگی قرار دیا گیا۔ وجدان کی یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر روحِ انسانی کو اپنے آپ سے اور اپنے مقصودِ زندگی سے شناسائی اور اپنی فطری اور وہبی عظمت کا احساس ارزانی ہوتا ہے۔ اور یہیں پر اس شعور کی نمود ہوتی ہے جسے اقبالؔ نے خودی کا نام دیا ہے خودی کا یہ تصور میری ناچیز رائے میں وہ اصل تصور

ہے جس کی طرف قرآنِ حکیم نے فکرِ اقبالؔ کی راہنمائی کی۔ اور یہ اس تصور سے قطعاً مختلف ہے جسے حکمائے مغرب نے نسلی برتری کے نظریے کا سہارا لے کر فرد کے سامنے رکھا اور پھر اس کا مفہوم اس مفہوم سے بھی یقیناً مختلف ہے جو ہمارے نوجوان طبقے میں عام طور پر مقبول ہے۔ یہ طبقہ اقبالؔ کے تصوّرِ خودی کو خود پرستی کے قریب لے آتا ہے اور نفس کو ایک باطل اور مہمل احساسِ کبر سے متصف کرنے کو تکمیلِ خودی کے ہم معنی قرار دیتا ہے۔

خودی کے باب میں یہ ایک دلچسپ غلط فہمی ہے اور قریب قریب وہی کیفیت رکھتی ہے جو عزتِ نفس یا سلف رسپکٹ SELF RESPECT کے تصوّرِ عام میں پائی جاتی ہے۔ سلف ریسپکٹ کے یہ معنی قطعاً نہیں ہیں کہ ہم اپنے سماجی رویے میں گردن کشاں سے رہیں اور ہمارے اندازِ نظر اور اندازِ عمل سے ایک احساسِ برتری نمایاں ہو اور ہم اپنے آپ ایسے محل اور موقع میں ڈالنے سے احتراز کریں جہاں ہمارے پندارِ اَنا کو ٹھیس لگ جانے کا احتمال ہو قطعاً نہیں۔ سلف رسپکٹ کا حقیقی تصوّر یہ ہے کہ ہم اخلاقی طور پر اپنے آپ کو اس قدر بلند کریں کہ اگر ہم کبھی چھپ چھپا کر کوئی برائی کرنے لگیں تو ہم کو اپنے آپ سے شرم آئے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا معیار ہماری اپنی نگاہ میں اتنا اونچا ہونا چاہیئے کہ خود اپنی نظروں سے گر جانے کا خوف ہمیں کسی سے برائی کرنے یا کسی ذلیل حرکت پر آمادہ ہونے سے بروقت روک سکے

Important

یقیناً اگر ہم باطنی طور پر اپنی عزت کرتے ہیں اور یہ عزت حقیقی قدروں پر مبنی ہے تو ہم کبھی چھپ کر بھی کوئی برائی نہیں کر سکیں گے کیونکہ دوسروں سے تو اپنے اعمال کو مخفی رکھ لینا ممکن ہے لیکن خود اپنی نگاہِ ملامت سے نکلنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔

عزت نفس کا یہ حقیقی تصوّر اپنے پھیلاؤ میں عرفانِ خودی کی حدود تک جا پہنچتا ہے، اور ایک گہری اور مثبت کیفیت اختیار کر کے انسان کو اپنی وہی عظمت اور خلقی قوت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے مومن کو اسی رمز سے آشنا کیا ہے اور اس کے سامنے ایک مکمل اور صالح زندگی کا نمونہ پیش کر کے اسے نیابت الٰہی اور تسخیرِ کائنات کی نوید دی ہے۔ اقبالؔ کا عشقِ پیمبری بھی اسی بنیادی نکتے کا آئینہ دار ہے۔ وہ اسلام کے پیغمبر میں ضمیرِ کائنات کی بیداری کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسے اس کی ذات میں ایک صالح، قوی اور مکمل زندگی منشائے الٰہی کی تکمیل کرتی نظر آتی ہے۔ اور یہی کیفیت اس والہانہ اور عاشقانہ عقیدت کی بنیاد بن جاتی ہے جس پر شعرِ اقبالؔ کا ایک رفیع الشان قصر تعمیر ہوا ہے

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اقبالؔ نے فرد کامل کا تصوّر مغرب سے مستعار لے کر اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر چسپاں کیا۔ ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اقبالؔ کا تصوّر فرد کامل کلامِ الٰہی سے ماخوذ اور اسوۂ حسنیٰ سے مستنیر ہے، اور بنیادی طور پر اس تصوّر سے سراسر مختلف ہے جو حکمتِ مغرب سے نسلی فوقیت، جارحانہ قومیت، اور طاقتور انفرادیت کے عناصر سہ گانہ کی آمیزش سے تخلیق کیا۔ اُسے انسانیت کے اس مقدس تصوّر سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ جسے جناب سرورِ کائنات نے اپنی مثالی زندگی کا پیکر عطا کیا اور جس نے یہ معیار قائم کیا کہ خلافت الٰہی کا منصب اسی فرد اور اسی قوم کو زیب دیتا ہے جو صداقت، شجاعت اور عدالت کی صفات عالیہ سے بدرجۂ اتم مزین و متصف ہو۔ اور اگرچہ اس میں کوئی کلام کہ جو افراد یا جو اقوام تقدیر الٰہی کے اس معیار پہ پوری اترتی ہیں، وہی زمین پر خلافت الٰہیہ کے قیام کا منشائے ربانی پورا کر سکتی ہیں لیکن از لبکہ اقبالؔ کا خطاب خود اپنی قوم سے ہے اور اس کی نگاہ ہنوز اس نور نبوت سے مستنیر ہے جس کی تابانیاں یقیناً ابد تک برقرار رہیں گی۔ اس لئے وہ خلافت الٰہی کو مرد مومن کا فطری ورثہ سمجھتا ہے اور اسے اس بازیافت پر مسلسل آمادہ کرتا رہتا ہے۔

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قُم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ

اور شعرا کی اس پراگندگی اور فرنگیوں کے اس افسوں کا ایک نہایت کارگر علاج رجوع الی اللہ میں دیکھتا ہے وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ فرد اس لئے سرنگوں ہے کہ وہ افق کی طرف نگاہیں بلند کرنے کی بجائے مٹی میں سے رنگین ٹھیکریاں چننے لگ گیا ہے اور قوم اس لئے بدحال اور پریشان ہے کہ وہ اپنی عظمت کے احساس سے ناآشنا ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ وہ فرد کو اس کی ہیچ کاری اور غلط روی سے آگاہ کرتا اور قوم کو اس کے مقام سے بار بار آشنا کرتا ہے۔ اور انہیں عظمت کے آخری تصور یعنی ذاتِ کبریا کی طرف بلاتا اور انہیں اپنے آپ کو اسی کی کبریائی میں کھو دینے اور پھر اسی سے ابھرنے اور اسی کی صفات سے حیاتِ تازہ پانے کی دعوت دیتا ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لا الٰہ الا اللہ

لیکن یہ مقام محمود جہاں مومن کا رشتۂ نیاز منتہائے کل کے سوا ہر محبوب اور ہر مقصود سے قطع ہو جاتا ہے۔ اُسے جبھی نصیب ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلب کو اس حد تک وسیع کرے کہ یہ کائنات اس کی پہنائیوں میں سما جائے اور وہ دنیا کا بادشاہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ان کیفیتوں سے ماوری ہو جائے جو اُسے اس کے مقصود خلقت سے غافل کر کے دنیا کے ادنیٰ لذائذ اور اس کے کمتر منافع کی طرف مائل کر سکتی ہیں۔ مومن کے مقامات میں یہ ایک نازک مقام ہے اور یہیں اس کی خودی اعزازِ تکمیل پاتی یا شکستِ درماندگی سے ناآشنا ہو جاتی ہے۔ اگر یہاں وہ اپنے سماوی مناصب سے پختہ طور پر وابستہ رہتا اور اپنے عزائم کی تکمیل میں ثابت قدم رہتا ہے تو خلعتِ خلافت اسی کے قد موزوں پر بالیقین راست آئے گا۔ ورنہ وہ اس سے موزوں تر

ہستی کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الّا
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

اور دل کی اس گواہی کے حصول کے لئے مومن کے سامنے ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے ذاتِ مصطفےٰ سے اکتسابِ خیر۔ میری ناچیز رائے میں حضورؐ کو خیر البشر اسی لئے قرار دیا گیا ہے کہ اُن کی فطرتِ صالحہ بشریت اور ارضیت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے سماوی رفعتوں کی انتہائی حدود تک کارفرما تھی۔ پھر مومن کو اپنی ارضی زندگی کی تکمیل کے لئے اس پیکرِ خیر سے بہتر اور کون سا رہنما میسر آسکتا ہے۔ پھر شاعرِ مشرق نے مومن سے کیا غلط کہا تھا۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تُو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں فرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

اقبالؔ کا مردِ مومن

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے خاتمے اور اسلامی سیاست کے زوال کے بعد تباہ حال اور پریشان خیال مسلمانوں کو جو رہنمائی میسر آئی اس کی کم و بیش پانچ کیفیتیں اب تک ہمارے سامنے آتی ہیں۔ سرسیّد کی رہنمائی، حالیؔ کی رہنمائی، محمد علی کی رہنمائی، اقبالؔ کی رہنمائی اور جناحؒ کی رہنمائی ________

ستاون کے ناکام ہنگامۂ آزادی کے بعد انگریز مسلمانوں سے سخت بدظن تھا اور انہیں خود ذلیل کرنے اور دوسرے کے ہاتھوں ذلیل کروانے پر تلا ہوا تھا۔ قدرت کی مصلحت اور تاریخ کے تقاضے نے اس وقت سرسیّد کو پکارا اور اس مردِ دانشمند نے میدان میں اترتے ہی وہ دلنواز راستہ اختیار کیا جسے مفاومت بکمترین کا طریق کہا جاتا

ہے۔ سر سید نے اس "لائن آف ریزسٹنس" پر چل کر انگریز کی معاندانہ سیاست کو مکمل شکست دی اور مسلمانوں کی ہراساں کیفیت اور شکست خوردہ ذہنیت کو طمانیت اور آسودگی سے آشنا کیا۔ انگریز مسلمان کی جس خصوصیت سے متنفر اور خائف تھا، سر سید نے مصلحت، وقت کے تقاضے سے اسے دبا دیا اور محاذ کا نقشہ اس طور سے بدلا کہ وہی مسلمان جو کل تک انگریز کا ہزیمت خوردہ دشمن سمجھا جاتا تھا آج اس کا خیر خواہ اور یارِ وفادار متصور ہونے لگا۔ یہاں ہمیں سر سید کی پالیسی یا اُس کی خوبی و قباحت پر بحث مقصود نہیں، بلکہ فقط یہی دیکھنا ہے کہ سرسید کے مشن کی تکمیل کے کم و بیش پچیس برس بعد اقبال نے مسلم ہندی کو جو راستہ دکھایا، اس کا پس منظر کیا تھا۔

حالی سرسید کے دست راست تھے۔ سر سید کی تعلیمی اور سماجی پیش قدمی میں جن جن مقامات پر استحکام کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ حالی اُسے اپنے ذمے لے لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیشتر توجہ قوم کی اُن بنیادی ضروریات کے حصول پر صرف کی جن پر قومی ترقی اور خوشحالی کی عمارت بلند ہونے والی تھی۔ مسلمان حالی اور سرسید کی بتائی ہوئی ڈگر پر چل نکلے تھے کہ یکایک مغرب میں بین الاقوامی صورت حال خراب ہوئی اور فرنگ کی استعماریت نے یورپ کے "مرد بیمار" کو اس کی آخری نیند سلانا چاہا۔ "ترک" خدام حرمین ہونے کے باعث اور اپنی اس وقت تک برقرار عسکریت کی بنا پر دنیائے اسلام میں ایک

ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اور اسلامیان ہند کی نگاہ میں آل عثمان کا زوال خود اسلام کے زوال کے ہم معنی تھا۔ پس وہ اپنے سب کام چھوڑ چھاڑ کر یکایک اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی ساری توجہ اپنے قومی کاموں سے ہٹ کر بیرون ملک کی اسلامی سیاست کی طرف مائل ہوگئی۔

اتنے میں پہلی جنگ عظیم برپا ہوگئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی رہنما قید یا نظربند کر دیئے گئے۔ ان رہنماؤں میں مولانا محمد علی مرحوم ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران میں ایک جبر عظیم نافذ رہا لیکن اس کے ختم ہوتے ہی، قومی آزادی کا ولولہ انگیز دشمنی کے ایک جذبے کے ساتھ مل کر ایک سیل رواں کی صورت میں بہہ نکلا، اور اپنی یلغار میں ان بیشتر تعمیری میلانات کو بھی بہا لے گیا جنہیں سرسید کی تحریک نے جنم دیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کا انتشار، جامعہ ملیہ کا قیام، تحریک ہجرت، ترک تعلیم، ترک ملازمت اور عدم تعاون اس سیلاب انقلاب کی چند یادگاریں ہیں۔ جو جامعہ ملیہ کے سوا، اسی کے ساتھ بہتی ہوئی صحرائے عدم میں جا پہنچیں اور اس کی خشکیوں میں جذب ہو کر رہ گئیں ______ یہ محمد علی کی قیادت کے عروج و زوال کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کا یہ گرم دل اور گرم گفتار لیڈر اگرچہ خود علی گڑھ تحریک کا پروردہ تھا۔ لیکن اس کے بانی سے بالکل مختلف مزاج رکھتا تھا، اور اس نے قوم کو وہ راستہ دکھایا جو سرسید کے بتائے ہوئے راستے سے یکسر مختلف تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ اپنا رخ بدل رہا تھا اور اس کے

تقاضے ایک جمی ہوئی حکمتِ عملی کے بدلنے کے بجا طور پر طالب تھے۔ لیکن عمل کی سرگرمی نے محمد علی کو تفکر کا موقع نہیں دیا اور وہ اپنے ہی کارناموں کے ردِعمل میں محصور ہو کر ناکامی اور موت، دونوں سے ہمکنار ہو گیا۔

اقبالؔ اور جناحؔ اس عرصے میں مدوجزر کے خاموش ناظر تھے۔ جناحؔ ہندوستانی سیاست کے تجربوں سے اپنے سیاسی تفکر کی تعمیر کر رہے تھے اور اقبالؔ کا روحانی اور الہامی تفکر اُسے فرد کی ممکنات اور "مردِ مومن" کے مقامات سے آشنا کرا رہا تھا۔ اقبالؔ کا عرصۂ فکر اس کے شعری اور فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے اسلامیانِ ہند کے دوسرے رہبروں کی تخیلی وسعتوں سے بہ درجۂ غایت وسیع تر تھا اور اس کی نظر اپنے معاصر رہنماؤں کی نظر سے بے اندازہ بلند تر، اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سرسیّد نے قوم کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی پر اپنی ساری توجہ مرکوز کی اور حالیؔ نے اس کی اقتصادی زبوں حالی کا علاج تجویز کیا اور محمد علی نے اُسے بین الاسلامی سیاست کی بھول بھلیوں میں ڈال کر خود بھی اپنی راہ گم کر لی۔ وہاں اقبالؔ کی بلند نظری بے تکلف ان احوال و مقامات تک پہنچ گئی جو فرد اور قوم دونوں کی دائمی اقدار اور دونوں کے حقیقی عروج و زوال سے نسبت رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فکرِ اقبالؔ اپنے عہد کے فطری تقاضوں کا مرہونِ تھا۔ اسلامیانِ ہند ایک شدید کش مکش کے بعد ایک قومیت کے سانچے میں ڈھل چکے تھے اور اب

ایک بڑی حد تک اپنے تمدن کی صورتیں اور حدود بھی متعین کر چکے تھے اور اس وقت وہ ایک ایسی راہنمائی کے منتظر تھے جو ان کے حقیقی مسائل کی گہرائی تک پہنچے اور انہیں زندگی کا ایک پایندہ پیغام دے، یہ رہنمائی انہیں تعلیماتِ اقبال کی حیات افروز کیفیتوں میں ملی اور فرد کے ذریعے سے قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

اقبال ہمارے سامنے دنیوی فارغ البالی یا اقتصادی خوشحالی کا کوئی تصوّر پیش نہیں کرتا۔ نہ وہ ہمیں کسی سیاسی منفعت یا ہنگامی کامرانی کی طرف بلاتا ہے، بلکہ وہ ہم میں سے ہر فرد کے سامنے ایک ایسا روحانی اور ایمانی نصب العین رکھ دیتا ہے، جو اس کے نزدیک مردِ مومن کی میراث اور زمین پر خلافتِ الٰہی کا نشان ہے اس کی پیش کردہ قدریں زمانے کی کروٹوں سے بدلتی نہیں، بلکہ مرورِ ایام پر خندہ زن رہتی ہیں اور خود زمانہ اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالتا اور درست کرتا چلا جاتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کا ایک وسیع پس منظر اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جن اقوام نے اپنے اپنے عہد میں غلبہ ارضی حاصل کیا، بیشتر صورتوں میں ان کے افراد کی تعداد مختصر اور ان کے ذرائع محدود تھے۔ اس کے باوجود اگر کامرانی سے ہم کنار ہوئیں تو یہ ان کے افراد کی غیر معمولی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔ یونان اور روما، فرنگ اور عجم، فرانسیسی اور المانی اپنے اپنے وقت پر اپنی عملی صلاحیتوں کو

بروئے کار لائے اور دنیوی کامیابی کے مقامات اعلیٰ تک جا پہنچے،
اور اگرچہ بدیہی طور پر ان کی یہ فتوحات اور کامرانیاں ان کے افراد ہی
کی ہمتوں اور سخت کوششوں کا ثمرہ تھیں۔ لیکن ان کی کیفیتیں سراسر مادی
اور ان کے مقاصد بیشتر پست اور بہیانہ تھے اور یہاں اقبالؔ کے ضمیر
میں مردِ مومن ابھرتا ہے اور وہ اپنے مخاطب کے سامنے کامرانی اور
سربلندی کا وہ تصور پیش کرتا ہے جو درحقیقت فوزِ عظیم ہے اور جسے
تقدیرِ الٰہی نے مومن کی میراث قرار دیا ہے۔ اقبالؔ کا مردِ مومن انسانیت
کا اکمل نمونہ اور اُن تمام خصائص سے متصف ہے جو تسخیرِ عالم کے لئے
ضروری ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اُسے وہ دولت بھی ارزانی ہوتی ہے
جسے فقر کہا گیا ہے۔ اور وہ سیر چشمی بھی ملتی ہے جو سلطانی و درویشی کے
امتزاج سے عبارت ہے۔ وہ دنیا کو مسخر کرتا ہے نہ اس لئے کہ اس میں
خداوند قدوس کی بادشاہت قائم کرے اور بنی نوعِ انسان کو ایک
امن دوام اور ایک راحتِ لازوال کی نوید دے۔

اقبالؔ اس آنے والی حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے جب اپنے
گردوپیش نگاہ دوڑاتا ہے تو اس کی نظر اس نوجوان پر آکر ٹھہر جاتی ہے جس
کی صلاحیتیں خوابیدہ لیکن جس کی ممکنات بے حد وسیع ہیں۔ وہ ایک ایسے
نظامِ حیات کا وارث ہے جس نے چودہ سو برس ہوئے اپنے جلوۂ اجلال سے
چشمِ عالم کو خیرہ کر دیا تھا۔ اور اگرچہ قوت و سطوت کا یہ آفتاب ایک
عرصے تک کسوف میں رہا لیکن اس سے اس کی وہ روشنی سلب نہیں ہوتی

جس کا سرچشمہ خود ذاتِ کبریا ہے۔ اقبالؔ اسی کو پکارتا ہے اور امامتِ ارضی کا منصب اسی کی ادنیٰ توجہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اقبالؔ کا یہ مثالی نوجوان سخت کوشی اور قربانی کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتا ہے جس کا سراغ نہ یونان کے انسانی دیوتاؤں میں ملتا ہے، نہ نطشے کے سپر مین انسانِ اعلیٰ ہیں اور کوئی اگر انسانی نمونہ اس کے تصور کے قریب پہنچتا ہے تو وہ اسلامی قرونِ اولیٰ کا مردِ کامل ہے جو بیک وقت سردار بھی ہے اور خادم بھی۔ سلطان بھی ہے اور قلندر بھی متاعِ دنیوی حاصل بھی کرتا ہے اور اسے حقارت سے بھی دیکھتا ہے اور ایک ایسی سیرت اور ایسے کردار کا مالک ہے جو "مصافِ زندگانی میں فولاد اور شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں" کی سی کیفیت رکھتا ہے۔

اقبالؔ کی نگاہِ دور بیں نے اس نمونے کے انسان کو اس وقت ہمارے سامنے پیش کیا، جب ہم فرنگ کی زنجیروں میں گرفتار تھے اور اگرچہ ان سے رہائی کی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا لیکن کون جانتا تھا کہ ایک ایسا وقت بھی بہت جلد آ جائے گا۔ جب اس کے مثالی مرد کو اپنی سیرت کی تکمیل کے لئے ایک آزاد مملکت کی فضا میسر ہوگی اور قدرت اس کی نمو سے شخصیت کے لئے ایسے اسباب بہم پہنچا دے گی اگر وہ چاہے تو بیکراں ہو جائے۔ شاعرِ مشرق نے انسانیتِ عظمیٰ کی تحصیل کا جو خواب دیکھا تھا، اور فرد کی بلوغ و تکمیل کا جو تصور پیش

کیا تھا، آج اس کی تعبیر و تجسیم کا وقت آن پہنچا ہے! کون ہے جو اس نوزِ عظیم کو قریب تر لانے کی سعادت حاصل کرے۔ میرا خطاب فرد اور مملکت دونوں سے ہے اور روحِ اقبالؔ دونوں سے اس کے جواب کی توقع رکھتی ہے۔

اے بندۂ مومن تو کجائی؟ تو کجائی؟

۱۴ر جولائی ۱۹۵۰ء

(۳)

اقبالؔ کی فکری رہنمائی ہمارے دوسرے اکابر کی رہنمائی سے قطعاً مختلف تھی اسے ہمارے روزمرہ کے مسائل سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کی نگاہ ان بنیادی کیفیات پر تھی جو قوموں کے عروج اور ان کی تعمیر سے نسبت رکھتی ہیں اور اس باب میں بھی اس کی فکر نے عروج و تعمیر کی نئی اقدار کے تعین میں ایک اجتہادی انداز اختیار کیا تھا۔ وہ خود ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا تھا جو اس برِاعظم میں سات سو برس کی سیادت کے بعد زوال کی آخری پستیوں تک پہنچ کر پھر سے ذرا سنبھلی تھی اور جمہوریت کے اس دور میں ایک کمزور اقلیت کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ فطری طور پر اس کی نگاہ کا مرکز یہی قوم تھی اور اگرچہ تاریخ عالم کے اوراق اس کے سامنے کھلے پڑے تھے اور یونان، مصر، روما، عجم فرانسیسی اور المانی کا صعود و ہبوط اس کے پیش نظر تھا۔ اور وہ ان تمام مراحل و منازل سے بھی آشنا تھا، جن سے گزر کر یہ اور دنیا کی دوسری

قلیل التعداد قومیں سطوت و کامرانی کی مختلف کیفیتوں سے ہم کنار ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کے مقاصد کا کھوکھلا پن اور ان کا روحانی اور اخلاقی تنزل بھی اس کی چشم حقیقت نگر سے مخفی نہیں تھا۔ وہ ان کی دنیوی فتوحات اور مادی ترقیات سے قطعاً متاثر نہیں تھا۔ وہ ان کے ہنگامی غلبوں اور ان کی عارضی کامیابیوں کو ایک فلسفی کی حکیمانہ بصیرت سے دیکھتا اور ایک دانائے راز کے محرمانہ انداز سے جانچتا ہے اور پھر ایک شان بے نیازی سے اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیتا ہے۔ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ ارضی مقاصد اور سفلی عزائم خاک سے اٹھتے ہیں۔ آب و گل کے امتزاج سے نشوونما پاتے ہیں اور بالآخر خاک ہی میں مل جاتے ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ غلبۂ ارضی کو وہ خلافت الہیہ کا ایک ضروری جزو سمجھتا ہے۔ اور زندگی سے قوت و حرارت ہی مراد لیتا ہے۔ لیکن ان کو وہ مقاصد کا درجہ نہیں دیتا بلکہ وسائل تک ہی محدود رکھتا ہے۔ اس پر آشکار تھا کہ آرزوئے انسانی سکندر بن کر چشمۂ حیواں کی تلاش میں نکلی، اور از بسکہ اس کا مقصود نظر فروغ روحانی نہیں بلکہ محض بقائے جسمانی تھا، اس لئے ناکامی و نامرادی کے صحرائے عظیم میں بھٹک کر رہ گئی۔ اور اس مقام تک بھی نہ پہنچ پائی جو انسانیت کی منزلِ اولیں ہے۔ اس نے دیکھا کہ چنگیز اور تیمور، ہنی بال اور نپولین زار اور قیصر اپنی اپنی قوموں کو ساتھ لئے تسخیر عالم کے ارادے سے

اٹھے، بڑھے، پھیلے اور پھر اس سیل رواں کی طرح جذب ہو کر رہ گئے جو کسی خشک ریگ زار میں آنکلتا ہے اور پھر وہیں کا ہو رہتا ہے۔

تاریخ عالم کا یہ منظر رہ رہ کر دہراتی اور مختلف پیرایوں اور کیفیتوں میں اسے ہمارے سامنے پیش کرتی رہتی ہے۔ اقبالؔ کی نگاہِ حکیمانہ نے نیرنگیٔ ایام کی اس کیفیت کا عین اس وقت جائزہ لیا جب ایک نوزائیدہ قوم تاریخ کا ایک نیا تقاضا پورا کرنے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ میری ناچیز رائے میں اقتضائے زمانہ کا یہ بروقت احساس ہی وہ بے بہا یافت ہے جو ما مورین کو اپنے اقران و اماثل میں ایک شانِ یکتائی اور ان کے پیغام کو ایک بے پناہ توانائی بخشتی ہے۔ اقبالؔ اپنی قوم سے عین اُس وقت مخاطب ہوا جب دنیا کے سب سے بڑے محاربے نے ان بیشتر اقدار کو جو شرفِ انسانیت سے منسوب ہیں، چکناچور کر دیا تھا۔ مادی جدل اپنے عروج کو پہنچ کر بے حاصلی اور نامرادی کی شدید ترین تلخیوں سے آشنا ہو چکا تھا اور حیران و سراسیمہ انسانیت، مایوس و متجسس نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور کائنات کے کسی گوشے سے اپنے سراپا اضطراب سوالات کا کوئی جواب نہیں پاتی تھی۔ ایسے میں وہ دانائے راز اپنی قوم کو وہ نسخۂ کیمیا دیتا ہے جو نہ صرف مسکنت و ذلت سے اس کی نجات اور علو و کامرانی سے اس کی ہم آغوشی کا کفیل ہے بلکہ جو اس کے وسیلے سے مجروح و درماندہ انسانیت کے لئے ایک نوید جانفزا کا حکم رکھتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

یہ نکتہ سرگزشت ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

دنیا کی امامت کا خواب تو نپولین نے بھی دیکھا تھا اور نطشے نے بھی، لیکن فاتح یورپ اور حکیم مغرب کے تصوّر فوقیت اور اقبالؔ کے تصوّرِ امامت کے درمیان ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ مغرب کا فوق البشر اپنی سطوت کی بنیاد انسان ادنیٰ کی مغلوبیت پر رکھتا ہے۔ اور اپنی نسلی برتری کے زعم موہوم کو انسانیت کا خون ملا کر ایک مستقل حقیقت بنانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس اقبالؔ کا تصوّر امامت کسی نسلی فوقیت پر مبنی نہیں اور نہ وہ امامتِ صالح کو حاکمیت کی خصوصیات سے ملوث کرتا ہے۔ اقبالؔ کا مردِ مومن بیک وقت دنیا کا رہبر بھی ہے اور اور رفیق بھی، سلطان بھی ہے اور خادم بھی، مقتدی بھی ہے اور مقتدی

بھی اور اس کا جذبہ تسخیر کسی قومی یا نسلی برتری کے تصور یا قوت و اقتدار کی کسی ادنیٰ خواہش سے تحریک نہیں پاتا، بلکہ اُس پیغام کی صدائے بازگشت سے ابھرتا ہے جو تقدیر ربانی کے منشا کے مطابق آج سے چودہ سو برس پیشتر بطحا کی وادیوں میں گونجا تھا۔

اقبالؔ کی تعلیمات کی بنیاد، جیسا کہ میں نے عرض کیا، تہذیب و تربیت انسانی کا اسلامی تصور ہے، مگر یہ اس کی وسیع تر بنیاد ہے اس پر اس کے فکر نے ایک بے مثال عمارت تعمیر کی جس کی رفعت آج اقصائے عالم کی تعمیرات پر خندہ زن ہے۔ اس کی بلندی اور عظمت کی اقدار مادی نہیں بلکہ سراسر روحانی ہیں۔ اور اسی لئے اس فوزِ عالی سے قریب ترین ہیں جو انسانیت کا مقصودِ آخر ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت لازمی ہے کہ اگرچہ فکرِ اقبالؔ کے عناصر ایک عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اگرچہ ان پر ایک خالص اسلامی کیفیت غالب ہے۔ لیکن اقبالؔ کا خطاب فطرتاً اس خطۂ ارض کے باشندوں سے ہے جسے خود اس کے زادبوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔

اقبالؔ کی عظمت نے مدت ہوئی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ارضِ مشرق کی آئندہ رہبری اس چھوٹی سی قوم کے حصے میں آئے گی، جو ہندوستان کی کہنگی کے باوجود اب تک تازہ دم ہے اور جس نے تاریخ میں اپنے لئے اب تک کوئی مقام حاصل نہیں کیا۔ وہ ازمنہ بعیدہ سے اب تک دوسروں کی لڑائیاں لڑتی اور دوسروں کے معرکے سر کرتی رہی ہے۔ لیکن اسے

خود اپنی سیرت کے ارتقا اور اپنی منازل کے استحکام کا اب تک کوئی موقع نہیں ملا۔ اس کی بصیرت نے اس پر یہ حقیقت آشکار کر دی تھی کہ عنقریب اس کے اہلِ وطن کو اپنے قومی نشو و ارتقا کا ایک۔۔۔ بے نظیر موقع ملے گا۔ اور اگر انہوں نے اس فرصت سے پورا فائدہ نہ اٹھایا تو پھر شاید حشر تک انہیں کوئی اور فرصت نہ مل سکے۔

چنانچہ اس نے اپنی تمام توجہ ان کی سیرت کی تعمیر پر مرکوز کر دی، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے فرد بلکہ فردِ نوجوان کو منتخب کیا۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری اور اپنے فکر دونوں کو فرد ہی پر مجتمع کیا ہے اور میری ناچیز رائے میں اس کے نزدیک فرد کی تعمیر ہی قوم کی تعمیر کا دوسرا نام ہے۔ از بسکہ کوئی مادی اقتدار یا فتوحات اس کے پیشِ نظر نہیں ہیں، بلکہ وہ اس قدر الاقدار اور اس ام القویٰ کو بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ جو تمام ممکناتِ انسانی کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے تشکیلِ فرد اس کے منصوبۂ تعمیر کا ایک نہایت اہم اور لازمی عنصر ہے، اور اس کی تعلیمات کی فضائے بسیط پر سر بسر چھا رہا ہے۔

انسانیت کے بیشتر معلموں اور رہبروں کی طرح اقبالؔ نے بھی اپنی تعلیمات کو سب سے پہلے ایک مجسمے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ مجسمہ "مردِ مومن" ہے، اور ان تمام خصائص سے متصف ہے جن سے اقبالؔ اپنے وطن کے مسلم جوان سال کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے اور از بسکہ اقبالؔ کا اندازِ فکر فلسفیانہ ہونے کے باوجود شاعرانہ ہے، اس لئے اس مجسمے

اس نصب العین کی طرف اُس کی پیش قدمی بھی جذباتی ہے وہ ہمیں اس
کے منطقی تجزیے کی مہلت نہیں دیتا۔ وہ ہماری فکر کو اس کا جائزہ لینے پر
آمادہ نہیں کرتا، بلکہ وہ اس کی قبولیت کے لئے ہمارے جذبات سے
اپیل کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اس مفروضے پر جم کر
آگے قدم بڑھاتا ہے کہ ہمارے دلوں کی راکھ میں، کہیں نہ کہیں ایمان کی
ایک چنگاری ضرور دبی ہوئی ہے۔ اور یہ راکھ ابھی کامل طور پر سرد نہیں
ہوئی۔ اس مفروضے پر ثبات کے بعد اقبالؔ کا پہلا قدم ایمان کے جس
جزوِ اعظم کی طرف بڑھتا ہے وہ معرفتِ نفس ہے، چنانچہ اس کی تعلیم کا
ایک بڑا حصہ معرفتِ نفس کے کشفِ اسرار پر مشتمل ہے اور از بسکہ اس کا
خطاب ایک ایسی قوم کے فرد سے ہے۔ جس کی سیادتِ ارضی کا آفتاب غروب
ہو چکا ہے، اور جس سے وہ تمام خوبیاں چھن چکی ہیں جو اس سیادت سے وابستہ
ہوا کرتی ہیں، اس لئے وہ فطری طور پر کمتری کے ایک شدید احساس میں
مبتلا ہے۔ اقبالؔ اپنے اعجاز نما کلام سے اس کے اعصاب میں ایک توانائی
اور اس کے قلب میں حرارت کی ایک کیفیت پیدا کرتا ہے اور پھر اس کے
ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے
بتاتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑے ورثے کا مالک ہے، اسے طاقت اور
خیر کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ودیعت ہوا ہے اور اس جہانِ آب و
گل میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا بار بھی اسی کے ناتواں شانوں پر رکھا
جانے والا ہے اور اسی لئے تقدیرِ اعلیٰ اور گردشِ دوراں دونوں اُس کی

حرکتِ عمل کی منتظر ہیں ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
تیرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اپنے مقصود کی طرف شاعری یہ جذباتی پیش قدمی اپنے اندر قوت و حرارت کا ایک طوفان بے پناہ لئے ہوتے ہے۔ اور دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے انقلابات کم و بیش ایسے ہی طوفانوں کے مرہون ہوا کرتے ہیں۔ اور یہاں تو جذبات کے اس سیلاب کے پیچھے حقائق ثابتہ کا وہ چشمہ صافی بھی ہے جس نے تشنہ کام انسانیت کو بارہا آبِ حیات سے سیر کیا ہے۔ اقبال کا پیغام محض ایک شاعر کا پیغام نہیں، بلکہ یہ فطرت کے اس نقیب کا پیغام بھی ہے۔ جس کی نگاہوں کے سامنے اس کے بے شمار اسرار فاش ہو چکے ہیں۔ یہ امت کے اس حکیم کا پیغام بھی ہے جس کی فکرِ رسا تاریخ امم کی گہرائیوں میں بارہا غوطہ زن ہو کر گوہر بدست نکلی ہے۔ اور یہ اُس قلندر کا پیغام بھی ہے جو اپنے مرشدوں میں

بارہا سروش کا ہم نفس اور جبریل کا ہم قدم رہا ہے۔

وہ نسخۂ کیمیا جو مشرق کے دانائے راز نے ہمیں دیا، اس کا پہلا جزو جیسا کہ آپ نے ابھی سنا، ایمان ہے اور ایمان کی اولین کیفیت معرفت نفس ہے۔ معرفت نفس کی ایک جھلک میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کی۔ اس کی بے شمار صورتیں اس کے کلام میں منظر آرا ہیں۔ اور چشم مشتاق کے لئے جلوۂ سینا کا حکم رکھتی ہیں۔

۱۱ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

(۳)

اقبال کے ہاں ایمان ایک بہت وسیع المعانی لفظ ہے۔ اور اس میں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب اور یوم آخر پر ایمان لانے کے علاوہ ایک اور جزوِ بسیط بھی شامل ہے اور وہ ہے مردِ مسلمان کا اپنے آپ پر ایمان لانا۔ اقبال اسی جزوِ ایمان کا پیمبر ہے اور اس نے اپنی تعلیم اور اپنے پیغام کا محور اسی اصلِ ایمان کو قرار دیا ہے اور مَن عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے قولِ قدسی کو اس کی منزلِ رفیع کا زینہ بنایا ہے۔

اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت صاف طور پر منکشف ہو جائے گی کہ اقبال کا مردِ مومن ہی اُس کے نظریۂ معرفتِ نفس اور ارتقائے خودی کا مظہر ہے۔ اور شاعر کے فکر نے اپنی اوّلین منزلوں میں احساسِ خودی اور عرفانِ نفس کے تصورات کو جس انداز سے

فروغ دیا تھا۔ مردِ مومن کی تشکیل اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔ اگرچہ اسرارِ خودی کی اشاعتِ اوّلین کے موقع پر یہ حقیقت بہت سی نگاہوں سے اوجھل رہی اور ارتقائے خودی کے مفہوم نے اس حد تک غلط فہمی پیدا کی کہ اقبالؔ کو رموزِ بے خودی کے اوراق میں ایک توانا اور نکھرے ہوئے نظریے کی توضیح میں بعض منتشر اور غیر ضروری افکار کا سہارا لینا پڑا۔ میری ناچیز رائے میں یہ مصلحت آمیز اقدام چنداں مفید یا نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ شعرِ اقبالؔ کا حکیمانہ عنصر اسی انداز سے اور اسی روش پر ترقی کرتا رہا۔ جو اس کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ اور بالآخر اس نے اس منزل کو پایا جسے آج ہم مردِ مومن کا مقام کہہ سکتے ہیں۔

اقبالؔ کا مردِ مومن اس عالمِ ہست و بود کا صدر نشین ہے اور دولتِ کائنات اس کے قدموں میں بکھری پڑی ہے۔ وہ اس کی طرف دیوانہ وار نہیں لپکتا، بلکہ ایک حقیقی شانِ بے نیازی سے اسے زیرِ قدم لاتا ہے۔ اس عالمِ اسباب میں بسر کرتے ہوتے بھی وہ اسباب کا غلام نہیں بلکہ اسباب کا بیش و پیش اور تعمیر و تہذیب خود اس کی رضا پر منحصر ہے اس کا یہ مقام خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے روزِ ازل ہی سے تجویز کیا گیا تھا۔

اقبالؔ کے وجدان اور اس کی نگاہِ حکیمانہ پر یہ راز عرصہ ہوا آشکار ہو چکا تھا کہ اس دنیا سے اسباب اور اس جہانِ مادہ پرست میں بھی کسی قوم کی حقیقی نجات اور سربلندی اُس کے مادی ذرائع پر مبنی نہیں

کیونکہ مادہ ہردم تغیر پذیر اور مادی اقدار ہر لحظہ انقلاب آشنا ہیں. چھوٹی قومیں بالخصوص اس بارے میں عاجز و درماندہ رہتی ہیں. اس لئے کہ ان کے مادی ذرائع بدیہی طور پر بڑی قوموں کے مادی ذرائع کا مقابلہ نہیں کر سکتے. اور پھر جب خود ہی مادی اقدار کا کوئی اعتبار نہیں تو قومیں چھوٹی ہوں یا بڑی، ان کی حقیقی زندگی کی بنیادیں مادی اقدار پر کیونکر رکھی جا سکتی ہیں. تاریخ عالم کے صفحات شاعرِ مشرق کی چشمِ بینا کے سامنے کھلے تھے اور مصر و یونان، بابل و نینوا، مغول و فرنگ، ہندی و رومی کا عروج و زوال اس کے پیشِ نظر تھا اور پھر اس تہذیب کا فروغ و ہبوط بھی اس کا مقصودِ نگاہ تھا، جو عرب کے صحرا نشینوں کو ارزانی ہوئی اور جس کے سائے دنیائے معلومہ کے گوشے گوشے پر چھا گئے. اسی تہذیب کا ایک سایۂ لرزاں علیں اس کی نگاہوں کا مرکز تھا. اور اسی کی لرزشیں اس کے فکرِ حکیمانہ کو دعوتِ نمو دے رہی تھیں. پس وہ ندائے ربانی جس نے آج سے چودہ سو برس پیشتر ہادیٔ اسلام کی وساطت سے ہمیں انتم الاعلون ان کنتم مومنین کا حیات افروز پیغام دیا تھا ایک بار پھر خاکِ پنجاب میں شاعرِ مشرق کے نطقِ حکمت آفریں کے وسیلے سے ہم تک پہنچی اور اس نوجوان قوم کو جو ایشیا کی سب قوموں میں تازہ دم تھی، یہ نویدِ جاں فزا دے گئی کہ دنیا میں خداوند قدوس کی نیابت مومن ہی کا مقدر ہے اور زمین کی بادشاہت اُسی کے فقرِ جہانگیر کو

سونپی گئی تھی ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

خداوند کے نائبِ ارضی کی جو خصوصیات اس شاہ پارے میں جو بیان ہوئی ہیں وہ خلقت یا اتفاق سے تعلق نہیں رکھتیں، بلکہ سراسر اکتسابی ہیں اور اقبال نے اس اکتساب کے لئے جس تربیت کو ضروری قرار دیا ہے، وہ فرد کی بیشتر ممکناتِ عالیہ کو بروئے کار لاتی ہے۔ ازبسکہ اس کے سامنے ایک ایسی قوم کا تصور تھا جو نہ صرف خود وہ بھولا ہوا سبق یاد کرے جو دنیا کے سب سے بڑے ہادی نے ڈیڑھ ہزار

برس گزرے ایک پسماندہ قوم کو بڑھا کر اسے سابقون اور فائزون کی صف میں لا کھڑا کیا تھا، بلکہ جو اس سبق کی صدائے بازگشت کو کائنات کے کونے کونے میں پہنچا دے اس لئے وہ اسے قوت و صلاحیت کی تمام احسن صورتوں سے مزین کرتا ہے اور اسی لئے وہ اس قوم کے ہر فرد صالح کے سامنے معرفتِ نفس اور تربیت روح کا ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک قوم کے صالح افراد اپنی وہبی عظمت نہیں پہچانیں گے جب تک وہ ان ممکناتِ جلیلہ کا احساس نہیں کریں گے جو ان کی دسترس میں ہیں، جب تک وہ ایک غلط اور بے بنیاد احساسِ کمتری کو اپنے ذہن کی خلوتوں ہی سے نوچ کر نہیں پھینک دیں گے، اس وقت تک وہ قومی پیمانے پر کسی ارتقائی عمل اور کسی انسانی خدمت کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔

اقبالؔ کم ہمتی، کم آگاہی، کم زوری اور کم ہمتی کا دشمن ہے اور چونکہ اس کا خطاب زیادہ تر نوجوانوں سے ہے، اس لئے ان برائیوں کے استیصال کو وہ ان کی تربیت کی پہلی منزل قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان میں ایک مثبت اندازِ نظر اور ایک توانا ذہنیت پیدا کرنے کا آرزو مند ہے۔ اور اعلیٰ دنیوی اقدار کی تحصیل کے ساتھ ساتھ وہ ان میں روحانی بلند نظری اور عالی حوصلگی کے نشو و نما کا بھی متمنی ہے۔ اور یہیں سے اس فقر کی ابتدا ہوتی ہے جسے اقبالؔ نے

مردِ مومن کا نشانِ امتیاز کہا ہے اور جسے وہ اپنے مقصودِ نظر نوجوان کے مایۂ فطرت میں گوندھ دینا چاہتا ہے۔ وہ اسے ایک سخت کوش اور بلند ہمت فرد کے علاوہ ایک مردِ درویش بھی بنانے کا طالب ہے، وہ اس کی خاک کو نور میں سمو دینا چاہتا ہے تاکہ وہ شکست سے ناآشنا اور زوال سے ماورا ہو جائے اور زمین پر اپنی بادشاہت کے ساتھ ساتھ خداوند لایزال کی نیابت کے فرائض بھی انجام دے سکے اور ظاہر ہے کہ خدا کی نیابت آدم کی بادشاہت سے بدرجہا بلند اور پائندہ تر ہے۔

معرفتِ نفس، احساس برتری کا پہلا زینہ ہے، اور احساسِ برتری مومن کے اپنے آپ پر ایمان لانے کا ذریعۂ اوّلین ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو منزل اپنی آسمانوں میں

مومن کا اپنے آپ پر ایمان لانا اپنے لئے امامتِ اقوام اور غلبۂ ارضی، اور اپنے خدا کے لئے الوہیت بے کراں کا بہ یک وقت اقرار ہے۔ اس ایمان میں عقل کی فتوحات کے ساتھ محبت کی تسخیرات اور عشق کی کامرانیاں بھی کارفرما ہیں۔ اقبال کا منظورِ نظر نوجوان جیسا کہ میں نے ابھی کہا، سپاہی بھی ہے اور درویش بھی، فرمانروا بھی ہے اور قلندر بھی۔ سخت کوش بھی ہے اور بے نیاز بھی اور یہی وہ کیفیت ہے جسے عقل اور عشق کے حسین امتزاج کا نام دیا گیا ہے۔ اقبال کا

فرد جب اس تربیت سے آراستہ ہو کر میدانِ عمل میں اترتا ہے تو تدبیر اس کی رکاب تھامتی اور تقدیر اس کی فتح و نصرت کا پھریرا لئے اس کے آگے آگے چلتی ہے اور پھر جب یہی فرد پھیل کر قوم کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کا تسلّط صالح، اس کی ممکنات بے کراں اور اس کی فتوحات جاوداں ہو جاتی ہیں۔ اور وہ زمین پر آسمان کی حکومت قائم کرتا اور فرشِ خاکی کو عرشِ عالی کا ہم پایہ کر دیتا ہے؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

ایشیائی شاعری میں شاید اقبال پہلا شاعر ہے جس نے انسان

کو کائنات کا مرکز قرار دیا اور اس فرد کو اس بات کا احساس دلایا کہ ؎

جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اور اگرچہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کا مردِ خود آگاہ، مردِ قلندر اور مردِ مومن اور ارتقائے فرد ہی مختلف منازل کے نام ہیں لیکن فرد کی تکمیل کا منشاء آخر اس جماعت صالحہ کی تشکیل ہے جو اپنے بے مثال عزم و قوت کی بدولت اور اپنے افراد کی بلندئ کردار کے بل پر اقوامِ عالم کی امامت کا منصب سنبھالے اور دنیا میں امن و اسلام کا دور واپس لائے یہی اصلِ ایمان ہے۔ اور یہی نہایتِ دین اور ام الکتاب نے امتِ وسطیٰ کو اسی منزل کی طرف بلایا تھا ؎

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

یکم اگست ۱۹۵۰ء

(۴)

میں ابھی یہ گزارش کر چکا ہوں کہ اقبال ہی مشرق کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیا اور اسی حیات افروز نظریے پر اپنے پیغام کی بنیاد رکھی اور اگر ذرا غور کیا جائے تو یہی وہ نظریہ ہے جسے قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو برس پہلے پیش کر کے انسانیت کی فکر اور اس کی حرکت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور صحرائے عرب کے خانہ بدوشوں کو نہ صرف روم اور عجم کی سرداری بخشی بلکہ انہیں

دنیائے معلومہ میں خداوند جل و علیٰ کی نیابتِ کاملہ بھی تفویض کی۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ ایک صحرائے لق و دق کے قابل قبیلے جنہیں پانی کا ایک چشمہ یا کھجوروں کا ایک جھنڈ قرنوں تک خانہ جنگی میں مبتلا رکھتا تھا، قبولِ اسلام کے بعد چند ہی سال کے اندر صحرا سے نکل کر اقصائے شرق و غرب میں پھیل گئے اور انسانیت کے فکری اور اخلاقی رہبر بھی تسلیم کر لئے گئے۔ تاریخ عالم کا یہ ایک ایسا عدیم النظیر واقعہ ہے کہ دانش آج بھی اُس پر انگشت بدنداں اور فکر آج بھی اس پر سر بگریباں ہے اور حکمت کو اس عظیم الشان معجزے کا سراغ، وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کی خلوتِ مقدس کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔

اقبالؔ کا پیغام اسی صدائے سرمدی کی تجدید اور اسی ندائے ربانی کی بازگشت ہے، اور ہمیں وہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے، جسے زمانے کی گردش اور مادی اقدار کے تسلط نے ہمارے ذہن سے محو کر دیا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؔ ممکنات انسانی کے تعین اور تجزیے میں حکمائے مغرب کے افکار سے بھی متاثر ہوا، لیکن اس کی یہ اثر پذیری اُس دور سے تعلق رکھتی ہے جب اس کا فکرِ جواں ارتقاء کی اولین منزلیں طے کر رہا تھا اور اس پر اس اُمّ القویٰ کا اعجاز آشکار نہیں ہوا تھا، جس کی منزل، فکر اور اس کی مادی اور منطقی یلغار سے ہزاروں سال کی مسافت پر ہے اور جسے ایمان کا روح افزا

نام دیا گیا ہے۔ شمع ایمان کے فروزاں ہوتے ہی فکرِ اقبال کو وہ منزل نظر آئی جو انسانیت کا مقامِ آخر ہے اور جسے قرآنِ حکیم نے فوزِ عظیم کے نام سے یاد کیا ہے اور پھر یہی منزل اس کا مقصودِ نگاہ ٹھہری، اور جوں جوں اُس کا فکر پختہ اور اس کا وجدان متجلی ہوتا گیا وہ ثابت قدمی سے اس کی طرف بڑھتا اور دوسروں کو اُس کی راہ دکھاتا چلا گیا۔

ہماری موجودہ نسل اُس سرودِ روح افروز میں جسے شاعرِ مشرق کی بانگِ رحیل نے پیدا کیا، اس درجہ گم ہے کہ اسے اس کے معانی کی گہرائیوں تک رسائی کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ یہ حقیقت کسی انصاف کی محتاج نہیں کہ اقبال کا نظریۂ خودی اور اس کی دعوتِ خود شناسی کلامِ ربانی ہی کی ایک شاعرانہ تفسیر اور سرودِ سرمدی ہی کی ایک مجازی تشکیل کا درجہ رکھتی ہے۔ تخلیقِ آدم کے عین بعد فرشتوں یعنی قوائے عالم کے مظاہر کو حکم ہوتا ہے کہ اسے سجدہ کریں اور یہ پیامِ سجود اس منشائے ربانی کا اعلان ہے کہ کائنات، خلاصۂ کائنات کے سامنے سرنگوں ہو، اور پھر عزازیل کا انکار بھی تقدیرِ الٰہی کے اس مقصد کے عین مطابق ہے کہ جو عناصر اس سطوت و قوت کے سامنے خم نہیں ہو سکے جو خلافتِ انسانی کے ساتھ ہی اسے ودیعت کی گئی تھی، انسان اپنی ارضی زندگی انہی پر غلبہ پانے میں بسر کرے اور رضائے الٰہی کے اس مقصود کو پہنچے کہ:-

ان اللہ سخر لکم ما فی السموٰت وما فی الارض

ہم نے آج تک اقبال کو کتابِ مبین کے شارح اور مفسر کی حیثیت سے نہ پہچانا ہے، نہ قبول کیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس نے وہ خرقہ کبھی زیبِ بر نہیں کیا جو مدعیانِ ارشاد و ہدایت کے تن پر عموماً دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ظواہر سے قطع نظر اگر ہمیں تحقیقِ حق کی سعادت ارزانی ہو تو ہمیں اس نتیجے تک پہنچنے میں قطعاً کوئی دقت نہیں ہو گی کہ اقبال کا نظریۂ خودی اور نظریۂ ایمان، دانشِ افرنگ کے مرہون نہیں بلکہ بالیقین کتاب اللہ سے ماخوذ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے حرم تک پہنچنے کی جو راہ اختیار کی وہ جوازِ فرنگ میں سے ہو کر گزرتی ہے۔

ہمیں اس سے قطعاً انکار نہیں کہ مغرب کے بعض دانش وروں نے بھی یقین کی قوتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اور عقل پر یقین کو جو فوقیت عملی حاصل ہے، اسے ابھارا ہے لیکن اس یقین اور اس ایمان میں کوئی مناسبت نہیں، جس سے اقبال کی جبین اکتسابِ نور کرتی ہے۔ نطشے کا سپرمین اپنے پندار میں گم ہے۔ لیکن اقبال کے مردِ مومن میں خود کائنات گم ہو جاتی ہے۔ مغرب کی نگاہ، قومیت کے افق سے پار نہیں جاتی اور وہ نسلی فوقیت کے سراب ہی کو آبِ حیات جان کر اسے غلط طور پر حیاتِ جاوداں کا ضامن سمجھ لیتا ہے۔ اس کے خلاف اقبال کا مقصودِ نظر اس نظامِ حیات کا قیام ہے، جس میں بندگی اور خواجگی بے معنی الفاظ ہو کر

رہ جائیں۔ اور انسان ہر نوع کی مخالف قوتوں پر غلبہ پاکر اس منزل تک پہنچ جائے، جو اس کے لئے روزِ ازل سے مقدر ہو چکی ہے۔ اور جسے قرآنِ حکیم نے "مقام محمود" سے تعبیر کیا ہے۔ اور جو افراد یا جو اقوام تقدیرِ الٰہی اور تدبیرِ انسانی پر ایمان لاکر اس زندگی کے نشیب و فراز طے کرتے چلے جا رہے ہیں، وہی مومنینِ صادقین ہیں اور دنیا کی کامرانی اور آخرت کی فلاح انہی کا حصہ ہے۔

اُولٰئِکَ ھُمُ الفَائِزُونَ وَاُولٰئِکَ ھُمُ المُفلِحُونَ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر زمان و مکان میں تکمیلِ انسانیت کی منزلِ اعلیٰ تک پہنچنا بے حد دشوار رہا ہے اور نشیب اور پستی کی طرف مائل، سیلِ حوادث کے ساتھ بہتے چلے جانا بے اندازہ آسان ــــــ اور شاید انسانی زندگی کی اسی کیفیت کے بیان کے لئے

لَقَد خَلَقنَا الاِنسَانَ فِی اَحسَنِ تَقوِیم، ثُمَّ رَدَدنٰہُ اَسفَلَ سَافِلِین

کا انتباہ معرضِ اظہار میں آیا تھا۔ اقبال نے ممکناتِ انسانی کے جس معراج کا تصور کیا ہے وہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، قرآن ہی کے معیارِ انسانیت سے ماخوذ ہے پس اس نے اسی کے حصول کے لئے انسان کو جس انداز سے تیار کیا ہے، وہ بھی اسی انداز کا عکس ہے جو قرآنِ حکیم نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ جس طرح کتابِ الٰہی میں جا بجا انسان کی بنیادی عظمت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اسے زمین پر

خلیفۃ اللہ کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ اور جن و ملک اور شمس و قمر کو اس کے تابع قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اقبالؔ کے الہامی کلام میں ہم جن کیفیات سے آشنا ہوتے ہیں ان میں عظمتِ انسان اور انسان کی قوتِ ایمان کے عناصر بدرجۂ غایت ممتاز ہیں اور پھر ایمان کے عناصر ہیں، انسان کا اپنے اُس منصب پر ایمان جو رضائے الٰہی نے اُسے تفویض کیا تھا اور جسے اقبالؔ نے احساسِ خودی سے تعبیر کیا ہے سب سے نمایاں ہے اور اس جذبۂ فائقہ کی ترجمانی کرتا ہے جو اس کے پیمبرانہ کلام پر سر بسر چھا رہا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن، جہاں خس و خاشاک

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ!
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اور پھر مومن کی وسعتِ تگ و تاز کا کچھ اندازہ ان اشعار سے کیجئے کہ ؎

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے، لیکن کماں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ، مقام آسماں سے دور نہیں
کہے نہ راہ نما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو
یہ بات راہروِ نکتہ داں سے دور نہیں

اقبالؔ کے آفاق گیر تصورِ عظمت اور اس کے مردِ مومن کی آسمان پرواز رفعت اور پھر اس کی عملی سیاست کے تصورات کے درمیان جو تضاد اور بعدِ عظیم نظر آتا ہے۔ میری نگاہ میں اس کی ایک ہی توضیح ہے اور وہ یہ کہ اس کی شاعری ملہمانہ ہے اور اس کا مرکز انسانِ صالح جو کسی خاص قوم یا قبیلے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ محض وہ شرائط پوری کرتا ہے جو زمین پر نیابتِ خداوندی کے لئے ضروری ہیں۔ اور اس کی سیاست مفکرانہ ہے جس کے عناصر ایک خاص زمان و مکان میں محدود اور ایک خاص نوع کی کیفیات سے متاثر ہیں۔ میری ناچیز رائے میں ان دونوں کا تقابل لاحاصل ہے اور ہمیں ایک شاعرِ آفاق کو اس کے کلام

ہی میں دیکھنا چاہیئے، اور اسے اس کے دیگر افکار سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ اقبالؔ کا خطاب اگرچہ بظاہر اس کی اپنی قوم سے ہے، اور اس کے کلام کے بیشتر معارف قرآن کریم سے ماخوذ ہیں، لیکن جس طرح خود قرآن ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ کل نوعِ انسانی کے لئے امید و نجات کا پیغام اور دانش و حکمت کے نکات لے کر آیا تھا، اسی طرح اس کی روشنی میں اقبالؔ نے سیادتِ انسانی اور قوتِ ایمانی کے جو رموز ہمارے سامنے پیش کئے ہیں وہ اس قدر آفاق گیر ہیں کہ عالم انسانیت ان سے ہمیشہ ہمیشہ تک اکتساب فیض کرتا رہے گا۔

مغرب میں شیلےؔ اور ورڈزورتھؔ نے اور مشرق میں حافظؔ اور ٹیگورؔ نے روحِ کائنات کو روحِ انسانی کا ہمنوا بنا کر اسے ایک سرورِ آسمانی سے آشنا کیا تھا اور اپنی روزمرہ کی قیود سے ایک عارضی فرار کا فرحت بخش موقع دیا تھا۔ اقبالؔ ان سب سے بلند پرواز ہے، کائنات کی ہم نفسی اس کے لئے کسی غیر معمولی یافت یا انبساط کی حامل نہیں ہے بلکہ وہ اسے اپنے جلو میں رکھتا اور اپنی توجہ کی ایک ادنیٰ حقدار سمجھتا ہے۔ مگر اس علوِ روحانی اور سرورِ جاودانی کے باوجود وہ اُس سوزِ تمام کا ہر دم جویا ہے جو اس کی آتشِ نفس کو برابر فروزاں اور اس شعلۂ قلندری کو جاوداں رکھے جس سے اُس کی شمعِ خودی اکتسابِ نور کرتی ہے۔ اقبالؔ کے نظریۂ خودی کی یہی وہ خصوصیت ہے، جو

اسے مغرب کی خود نظرانانیت سے ممتاز کرتی اور اُسے مہر و ماہ کا ہم سفر بناتی ہے ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے
نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے
مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

اقبالؔ کا انسانِ کامل

اقبالؔ کے کسی طالب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس نے ہمیں انسان کامل کا تصور دیا ہے۔ خود ہی اس کی تمثیل بھی پیش کردی اور یہ تمثیل جناب سرور کائنات کی ذات مبارک ہے۔ اقبالؔ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو والہانہ عقیدت تھی۔ اگرچہ اس میں جذباتی عنصر نمایاں تھا۔ لیکن میری ناچیز رائے میں اس کی بنیاد اسی احساس عظمت پر قائم تھی جو اقبالؔ سے پہلے بعض دیگر اکابر حکمت و فکر کو، جن میں مسلم اور غیر مسلم سبھی شامل ہیں، بدرجۂ وافر ارزانی ہوا۔ کارلائل اور گبن نے حضور کی ذات میں انسانیت کاملہ کا ظہور جس زاویے سے دیکھا وہ قطعاً غیر جذباتی تھا لیکن ازبسکہ ان کی نعصب تعصب کے گرد و غبار سے میلی کہیں ہوئی تھی۔ اس لئے جب وہ مقصود کی تلاش میں

کائنات کا جائزہ لے چکے تو بالآخر اسی خلاصۂ کائنات پر آ ٹھہری جس سے خوب تر انسان آج تک خلق نہیں کیا گیا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان کا تصورِ انسانیت اور معیارِ عظمت ایک عالم گیر حیثیت رکھتا ہے اور اسی معیار پر دنیا کی دیگر عظیم شخصیتوں کو بھی پرکھ چکے تھے اور شاید یہی خصوصیت اس معیار کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ لیکن شاعرِ مشرق نے اس خارجی معیار سے چنداں فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ ایک عاشقِ صادق اور ایک دانائے راز کی دوگونہ حیثیت میں اس نورِ ہدیٰ سے اکتسابِ صداقت کیا جو مدت مدید کے بعد کائنات کے افق پر ہویدا ہوا تھا اور جسے ابد تک انسانیت کی رہبری مقدر کی گئی تھی۔

یہاں میں یہ تاثر پیدا نہیں کرنا چاہتا کہ اقبال کی نوائے کارگر سراسر سیرتِ پیغمبری ہی کی تفصیل شعری ہے، ہرگز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے فکرِ حکیمانہ کو جب رفعتِ پرواز ملی اور اس نے چار دانگ عالم میں حیاتِ انسانی اور اس کی اسی اقدار کا جائزہ لیا اور اس حقیقتِ عظمےٰ تک رسائی حاصل کی کہ کائنات کی تمام رفعتیں مومن کے زیرِ قدم اس کی تمام تر وسعتیں، اس کے حلقۂ خودی میں محصور اور اس کی کل ممکنات اسی کے کشودِ لب کی منتظر ہیں تو شاعر یہ راز اہلِ عالم تک پہنچانے سے پہلے توفیقِ الٰہی سے اس کی تمثیل کا طالب ہوا اور اس کی جستجو میں وہ اکنافِ عالم کا گوشہ گوشہ چھانتا تاریخ کے دور افتادہ

دھندلکوں تک پہنچ گیا۔ لیکن اس کا تصوّر شرمندۂ تصویر نہ ہو سکا اور وہ مایوس ہو کر مراجعت پر مائل تھا۔ یہ دفعتاً اسے یہ عرفان ارزانی ہوا کہ وہ نگارِ اوّل و آخر جسے وہ کائنات کے آخری گوشوں تک تلاش کر آیا ہے۔ لولاک کا نقاب اوڑھے خود اس کے کعبۂ دل میں جلوہ آرا ہے ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں
سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں
خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

اور جمالِ نبوت کے اس پرتو کے بعد جب شاعر بزمِ عالم میں واپس آیا تو ایک قلبِ گداختہ اس کے پہلو کو اور ایک جانِ مضطرب

اس کے پیکر کو بے تاب کر رہی تھی اور اس کا بادۂ فکر خم شعر میں ڈھل ڈھل کر سرمستانِ ازل کو دعوتِ جام دے رہا تھا۔ فکر و وجدان کا یہ امتزاج شعرِ اقبال ہیں اس کیفیت کا خالق ہے جسے ہم کسی ایک لفظ کی غیر موجودگی میں عشق و عرفان کے نام سے پکارتے ہیں اور اس امتزاج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عرفان عشق کا پیش رو ہے شاعر کا ذہن اس کے وسیع مطالعے اور مشاہدے کے علاوہ کتاب اللہ کے معارف سے روشن ہے اور وہ فطرت کے اسرار کو حکمتِ الٰہیہ کی نایابیوں میں بے نقاب کرتا اور اس کشف کے جلووں سے اپنی روح کو منیر کرتا چلا جا رہا ہے۔ یکایک اسے اس حقیقت کا شدید احساس ہوتا ہے کہ اس کی معرفت جس مقصود کی تلاش میں ہے وہ ذات پیغمبر کی صورت میں اس کی روح جہاں کو خود دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کے لئے سیرتِ رسول میں عظمتِ انسانی کا احساس کوئی نیا احساس نہیں تھا۔ لیکن یہ حقیقت قطعاً ناقابلِ فراموش ہے کہ وہ احساسِ بے پایاں ایک قطعاً جدید اور عظیم الشان یافت کی حیثیت رکھتا ہے جو اسے فلسفہ جدید اور قرآن حکیم کی روشنی میں انسانیت کاملہ کے عرفان کے بعد ذاتِ پیمبر میں اس کی مکمل تشکیل و تمثیل سے حاصل ہوا۔

اس عرفان کی حیثیت کسی لحاظ سے القائے ربانی اور روحِ آسمانی سے کم نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ عشق ہمہ گیر کا پیش رو ثابت ہوا۔

جس سے خود شاعر کی روح اکتساب سوز کرتی اور اپنے اقران و اماثل کو اس کی تپش سے حیات تازہ عطا کرتی رہی۔

اقبال کی نگاہ میں حضور علیہ السلام کی ذات انسانیت کا محض ایک پیکر لطیف نہیں تھی۔ بلکہ خود انسانیت ایسے بھرپور روپ میں ابھر کر حضورؐ کی ذات میں جلوہ آرا ہوگئی تھی۔ وہ دوسرے نبیوں کی طرح محض خدا کے پیغام بر نہیں تھے۔ وہ دوسرے مصلحین کی طرح محض تلقین کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ وہ دوسرے فاتحین کی طرح محض تلقین کے لئے پیدا نہیں کئے گئے تھے بلکہ وہ صفات انسانی کے ایک احسن اور مکمل نمونے کی صورت میں زمین پر خداوند قدوس کی بادشاہت قائم کرنے اور انسان کو اس کی امکانی بلندیوں پر پہنچانے کے لئے مامور کئے گئے تھے اور انہوں نے انسانی معاشرے میں عدل و مساوات اور صبر کے نئے نئے معیار قائم کرنے میں جس بے مثال شجاعت اور عزیمت کا ثبوت دیا وہ بیک وقت انتہائے عظمت کی مظہر اور انتہائے محبت کی خالق تھی اور یہ وہ مقام ہے جہاں عرفان اپنا دامن عشق کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور وہ دونوں محیط جذب و احساس میں اس طرح غوطہ زن ہو جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا محال نظر آتا ہے۔

شعر اقبال کی اس کیفیت کی بہترین مثال وہ نظم ہے۔ جسے اُن کے پہلے مجموعے میں بلال کا نام دیا گیا ہے اور جو نبی کی ذات میں انسانیت

کاملہ کے پرتو کو نہایت دل آویز طریق سے پیش کرتی ہے اور عرفانِ عشق کے امتزاجِ لطیف کو ذاتِ اقدس کا آئینہ قرار دیتی ہے۔ سنیے۔

لکھا ہے ایک مغربیٔ حق شناس نے
اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولاں گہ سکندر رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دنیا کے اس شہنشہ انجم سپاہ کو
حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا
آج ایشیا میں کوئی اسے جانتا نہیں
تاریخ داں بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلال رضؓ وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر

جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلال
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشاہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخ پیر
اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

کلامِ اقبالؔ میں عشق کو جو ممتاز مقام حاصل ہے اس کا اظہار یہاں ضروری نہیں۔ لیکن یہ بات یقیناً قابل لحاظ ہے کہ شاعر کے عناصر عشق میں عشق محمدی مقام اولیں رکھتا ہے۔ اقبالؔ کے فکرِ رسا نے خودی یا ایمان تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا وہ خود بخود اپنی منشا کی تکمیل کے لئے جناب رسالت مآب کی ذات گرامی تک پہنچ گیا۔ یہ منزل اس کے لئے مقام حیرت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے اس یافت کا اثر شاعر کے فکر و وجدان پر اس شدت سے ہوا کہ وہ اس کی شخصیت اور اپنی تخلیق دونوں میں عشقِ پیمبر کا ایک داستان گو بن گیا۔ اور پھر احساس کی ترفیع کے بعد اقبالؔ نے انسانیت کاملہ کا وہ زندہ تصور پیش کیا جسے وہ مرد مومن کا نام دیتا ہے اور جس کے فانوس ایمان میں شمع عشق فروزاں جس کے احاطۂ ایقاں میں یقیں بالذات عیاں اور جس کے منصب عالی میں نور عمل نمایاں ہے۔ مومن اس زمین پر سنت رسول کا وارث اور سیرتِ رسول کا نمونہ ہے اور وہ اس مشن کی تکمیل کرتا ہے، جس کی اساس تقدیر الٰہی نے چودہ صدیاں گزریں رسول اللہ کے مقدس ہاتھوں سے رکھوائی تھی۔ مومن کا قلب گداختہ اسی حرارت کا امین ہے جس سے

جس سے صدیق اکبر کا سینہ گرم ہوا۔ مومن کی چشم بصیرت اسی نور سے روشن ہے جو بلال کی آنکھوں میں چمکا اور مومن کی فردِ عمل اسی ذوق کی رہین ہے جو فاروق اعظم کو عطا ہوا۔ پھر کائنات کی وسعتیں اس کے لئے کیوں محدود اور موجودات کی رفعتیں اس کے لئے کیوں نہ سرنگوں ہو جائیں۔

افلاک پہ ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن
ہو حلقۂ یاراں تو ہے ریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اقبالؔ کا نوجوان

جن صاحبوں نے کلامِ اقبالؔ کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات مخفی نہیں کہ دیگر اکابر فن کے کارناموں کی طرح اقبالؔ کی شاعری بھی تین واضح حصوں میں منقسم ہے۔ اُن کے شباب کی شاعری، ان کی پختہ سالی کی شاعری اور آخر میں ان کے بڑھاپے کی شاعری۔ لیکن یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ان تینوں ادوار میں ان کا مخاطب صرف نوجوان اور موضوعِ سخن بیشتر وہ کیفیات رہی ہیں جو شباب سے خاص ہیں۔ اور یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبالؔ اگرچہ اپنی جوانی ہی میں بلوغِ فکر کے اعتبار سے پختہ سالی اور پختہ سالی میں پیرِ دانا ہو چکے تھے، لیکن ان عناصر کے اعتبار سے جو ان کی شاعری، ان کے فکر، ان کے جذبات، ان کے محسوسات اور

ان کے پیغام کے بنیادی عناصر ہیں، وہ ہمیشہ جوان رہے اور ان کے سخن کی حرارت اور ان کے پیغام کا خروش نوجوانوں کے خون کی روانی تیز کرتا اور انہیں تسخیرِ ذات اور تسخیرِ کائنات دونوں پر آمادہ کرتا رہا۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور فطری طور پر مطالعے اور تیاری کا دور ہے ان کی جوانی کی شاعری میں وہ سوز اور دہ سیمابی کیفیت موجود ضرور ہے جسے ان کے نظامِ سخن کی اولین خصوصیت کہنا چاہیئے اور جو آگے چل کر ان کی فکری اور الہامی شاعری پر سر بسر چھا گئی، لیکن ابھی اس نے وہ تلاطم انگیز اور آفاق گیر رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو شعرِ اقبال کے درمیانی اور آخری دور سے نسبت رکھتا ہے۔ اقبال کا شعرِ شباب خود نگری اور خود شناسی کی ایک لطیف و جمیل کیفیت سے سرشار ہے اور جب شاعر اس کیفیت سے ذرا چونکتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش پر بھی ایک نظرِ غائر ڈال لیتا ہے لیکن اس کے پاس اپنے مطالعۂ نفسی کے اظہار اور ایک دلِ دردمند کی پکار کے سوا کوئی پیغام نہیں ہے۔ نوجوان شاعر اپنے نوجوان ہم عصروں کو فطری طور پر کوئی پیغام دینے سے ہچکچاتا ہے اور یہ اس کی حقیقت پسندی اور عظمت کا ایک قطعی نشان ہے۔

اس دور کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اس کی خود نگری اور خود شناسی ہے اور اس کے بعد اس طوفان کے ابتدائی خروش اور اس کی اولین بے تابیوں کا ایک ہلکا سا

اظہار ہے جو اس کے قلب و جگر میں پرورش پا رہا تھا۔ نوجوان اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی رہبری کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ محض انہیں اپنے پردۂ دل کا ایک کونا اٹھا کر دعوتِ نظارہ دے دیتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی بغایت درجہ دلچسپ ہے کہ اس منزل پر خود اس کی اپنی زندگی کی کیا کیفیت تھی اور اس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس انداز سے جاری تھی۔ اس کا جواب خود شاعر نے ایک نہایت لطیف پیرائے میں یوں بیان کیا ہے ؎

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوّف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کراماٰت کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبالؔ کہ ہے قمریٔ شمشاد معانی
پابندیٔ احکام شریعت میں ہے کیسا
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیل علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی
مجموعۂ اضداد ہے، اقبالؔ نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے، طبیعت خفقانی

رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قربِ مکانی
خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت سے شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبالؔ کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

بظاہر یہ ایک لطیف مکالمہ ہے لیکن غور کیجئے تو اس کے ذریعے سے نوجوان شاعر نے اپنے نوجوان ہم عصروں کو نہ صرف اپنی سیرت کی تعمیر کا ایک ہلکا سا منظر دکھا دیا ہے۔ بلکہ اس لبرلزم، اس روشن خیالی اور کشادہ دلی کا ایک واضح تصوّر بھی ان کے سامنے رکھ دیا ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کے خلاصے اور عطر کا دوسرا نام ہے۔

نوجوان اقبالؔ جب اس جوہرِ طبیعت اور اس اندازِ تربیت سے آراستہ ہو کر تکمیلِ تعلیم کے سلسلے میں یورپ گیا تو اسے دیارو امصارِ مغرب میں اپنی فکر کو جِلا دینے اور اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ ان کا ایک حیرت انگیز اثر اس کی طبیعت پر یہ ہوا کہ وہ یورپ کی جارحانہ وطن پرستی سے بیزار ہو گیا اور ملّتِ اسلامیہ کی وحدت کا تصور اپنی پوری شدّت سے اس کے ذہن میں ابھرا اور اس کو یقین کامل ہو گیا کہ ہندی مسلمان بلکہ مسلمانانِ عالم کی نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خاص اسلامی اقدار کو

زندہ کریں اور مذہب کے ظاہری ڈھانچے سے نہیں بلکہ روح اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اصول کشید کریں جن کی صداقت پر خود گردشِ زمانہ نے بیسیوں بار اپنی مہر ثبت کی ہے۔

چنانچہ یورپ کے دورانِ قیام میں ان کے جن خیالات نے شاعری کا جامہ پہنا وہ اکثر و بیشتر اسی تاثرہ کے سرمایہ دار ہیں۔ پنجاب کے بابائے اُردو یعنی شیخ عبدالقادر مرحوم بھی انہی دنوں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے مقیم تھے مگر وہ اقبالؔ سے ایک سال پہلے مراجعت فرمائے وطن ہو گئے تھے ان کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اقبالؔ نے انہیں ایک مراسلہ منظوم لکھا جو ان کے پہلے مجموعۂ بانگِ درا میں تمام و کمال موجود ہے یہ مراسلہ بظاہر ایک دوست کا خط ہے مگر درحقیقت اس انقلابِ روحانی اور دردِ پنہانی کا طوفان ہے جو ان ایام میں شاعر کے دل دردآشنا میں کروٹیں لے رہا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر\
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں\
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط\
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں\
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق\
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ملّتِ اسلامیہ کے ایک حساس نوجوان کے سینے میں جس قسم کے احساسات تلاطم برپا کر رہے تھے۔ یہ نظمِ لطیف ان کی ہلکی سی آئینہ داری کرتی ہے لیکن یہاں بھی اقبال نے خود شناسی اور خود نگری سے صرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور اپنی بے تابیوں میں محض ایک رفیقِ دور افتادہ کو شریک کیا ہے۔ اپنے معاصر نوجوانوں کو اس نے کوئی پیغام

نہیں دیا۔ اگرچہ اپنے سینے کو چیر کر دکھانے سے ایک خاموش دعوتِ ہم نفسی ضروری ہے۔

پھر وہ دور آیا۔ جب اقبالؔ نے پختہ سالی کی منزل میں قدم رکھا اور وہ روایتی حق حاصل کیا جس کی رُو سے شاعر یا مفکر اپنے احساسات براہِ راست اپنے مخاطبین تک پہنچا سکتا ہے۔ اقبالؔ اس بارے میں بہت وضع دار تھے۔ اور انہوں نے اس حق کا اس وقت تک استعمال نہیں کیا جب تک وہ نوجوانی کے دائرے سے نکل کر سچ مچ پختہ سالی کی منزل میں داخل نہیں ہو گئے اور دیکھئے یہاں بھی ان کے مخاطبین محض نوجوان تھے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ نوجوان کا نام لے کر اس سے خطاب نہیں کیا لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ان کے موضوعاتِ سخن میں سے کوئی ایسا موضوع نہیں جس کا تعلق نوجواں، جواں مرد، مردِ جواں ہمت اور اس کے عمل اور اس کے کردار سے نہ ہو۔ بہر حال موجودہ مقالے میں، میں نے اپنے آپ کو محض ان مثالوں تک محدود رکھا ہے، جن میں نوجوان سے بدیہی طور پر خطاب ہے یا اس کی طرف صاف صاف اشارات ہیں۔

بانگِ درا کی معروف نظم ' خطاب بہ نوجوانِ اسلام میں اقبالؔ نے ایک منفیانہ رنگ اختیار کیا ہے، اور وہ نوجوانِ اسلام کی بیش نظر زبوں حالی کا تلخ جائزہ لے کر خاموش ہو گئے ہیں۔ ابھی انہوں نے اسے صرف شرمسار کیا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گلے سے نہیں لگایا' اور نہ

اس منزلِ گم کردہ کی طرف اشارہ کیا ہے جسے از سرِ نو حاصل کرنا اس کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔ مگر ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے، کہ شاید یہ احساسِ ندامت اقبالؔ کے مخاطب نوجوان کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسا اس کے بعد پیدا ہونے والا جذبۂ یقین۔

فرمایا کہ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا
غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

اقبالؔ نے ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو تین جدید تصورات دیئے تھے خودی، فقر اور عشق یا یوں کہیئے کہ ان تین الفاظ کے نئے مفاہیم کئے تھے۔ یہاں ان تصورات کی تفصیل و تفسیر کا نہ موقع ہے نہ وقت لیکن مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ احساسِ خودی سے مراد عظمتِ انسانی اور اس کی خوبیوں، ذمہ داریوں اور بلندیوں کا احساس تھا۔ فقر کے معنی مسکنت نہیں ہے بلکہ وہ سیر چشمی اور بے نیازی کی کیفیت ہے جو ادنیٰ دنیوی فوائد کی طرف سے بعض سعید ارواح میں پیدا ہو جاتی ہے عشق کا مطلب کسی مہ جبیں لعبتِ ہندی کا عشق نہیں ہے بلکہ وہ گرمیٔ دل اور جذبۂ کامل ہے جس سے مالا مال ہو کر انسان ایک بلند، روشن

اور پاکیزہ زندگی بسر کرتا ہے اور بڑے بڑے کارنامے ایسی آسانی سے سرانجام دے پاتا ہے کہ وہ ادنیٰ حساب داں جسے عقل کہا جاتا ہے، حیران و سرگشتہ رہ جاتی ہے۔ ان تصورات کو اقبال نے مومن کی ذاتِ گرامی میں یک جا کر دیا ہے۔

یہ بات بالکل عیاں اور قطعاً طالبِ ثبوت نہیں کہ ہر نسل میں جدید تصورات کے قبول کی توقع ہمیشہ نوجوانوں ہی سے کی جاتی ہے۔ کسی نسل کے بڈھے خواہ کیسے ہی دانشمند کیوں نہ ہوں۔ نئے تصورات کو کبھی خوش آمدید نہیں کہتے، بلکہ ہمیشہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ اقبال اس بارے میں سر سید احمد خاں سے زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے تھے لیکن ان کے تصورات اس کلیۂ عام سے مستثنیٰ ہرگز نہیں تھے اور اس امر میں شک کی قطعاً گنجائش نہیں کہ شاعرِ مشرق نے بالارادہ اور بالقصد اپنے جدید تصورات نوجوانانِ اسلام ہی کے سامنے پیش کیے۔ اور ان کی تفصیل و تشریح کے سلسلے میں انھی کو اپنا مخاطب بنایا۔ ایک داخلی ثبوت اس دعوے کا یہ بھی ہے کہ بیشتر وہ خوبیاں جو اقبال ان تصورات کے مجموعے یعنی مردِ مومن میں مرکوز کرتا ہے، وہ محض جوانوں ہی میں پائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً سوز، عمل، وسعت، بے کرانی، پرواز، بے نیازی، قوت اور بے خوفی۔ ایک اور ثبوت اس نظریے کا یہ ہے کہ اقبال کا محبوب پرندہ شاہین جو فقر، بلند نگاہی، قوت اور گرمیٔ خون کا پیکر ہے شباب ہی کی صفات کا مظہر ہے۔

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور ایک بڑی حد تک اس کی الہامی شاعری کا دور ہے۔ اس دور میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ اس کے وطن کے نوجوانوں پر عنقریب ہی نیابت الٰہی کی ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہیں۔ اپنے کلام میں وہ بار بار اس آنے والی عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ پیشین گوئی عین اسی طرح الفاظ کے معیار پر پوری اترتی ہے جس طرح تبت اور چین کی بیداری اور مغربی اثرات سے آزادی کی پیش گوئی کہ یہ واقعہ ان کی وفات کے برسوں بعد معرضِ وجود میں آیا۔

دنیا کی امامت کے فرائض کے لئے شاعرِ مشرق فرسودگانِ بے عمل اور پیرانِ بے مصرف کی تلاش میں نہیں تھا بلکہ اس کی تمام تر امیدیں اور تمنائیں جوانوں ہی سے وابستہ تھیں۔ وہ ان میں سے ہر صاحب دل نوجوان

کو ملّت کے مقدر کا ستارہ قرار دیتا ہے اور اسی کیف یافت میں پکار اٹھتا ہے کہ ؎

اگر جواں ہوں مری قوم کے صبور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

اور پھر چلتے چلتے قلندر ہی کی زبان سے جوان تشنۂ علم و عرفان کو ایک نکتے کی بات سمجھا جاتا ہے ؎

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو مرے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

اور آخر میں ۔ تشنۂ علم نوجوان کے عین مقابل مسندِ عمل نوجوان

کی ایک تصویر بھی دیکھتے چلیئے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہو ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلاہ داری

اقبال

پیغمبرِ حرکت و حرارت

اقبال کے ایوانِ شاعری میں جو صدائے بازگشت فضا کو شاید ابد تک لرزاں رکھے گی. وہ اس کے سرودِ خودی کی گونج ہے۔ زمانہ آج بھی اُسے شاعرِ خودی کے نام سے پہچانتا ہے اور آج سے صدیوں بعد بھی اس کے شاعرانہ تصورات میں تصوّرِ خودی ہی کو اولیت کا شرف حاصل رہے گا. اسی طرح اس نے جن تصورات کو متشکل کیا ہے. اُن میں مردِ مومن کا تصور ایک دوامی اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے. یہ دونوں حقائق مسلم ہیں اور ان کے ثبات و قیام میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن شاید اس بات پر بہت کم غور کیا گیا ہے کہ اس کی شاعری کا وہ کون سا عنصر اور اس کے سخن کی وہ کون سی کیفیت ہے، جس نے ان تصوراتِ فائقہ کو جنم دیا اور متشکل کیا اور اس کے سراپائے فن میں زندگی

کی روح پھونکی۔

اقبال کی شاعری کی عمر کم وبیش چالیس برس ہے۔ اس عرصے کے مختلف ادوار میں اس نے شاعری بھی کی، ساحری بھی کی، اور پیغمبری بھی کی، اسی اثناء میں اس کی جوئے سخن بہارستانِ شباب سے گنگناتی ہوئی نکلی اور صحرائے فلسفہ و حکمت کی وسعتوں کو ایک دریائے مواج کی صورت طے کرتی ہوئی بالآخر عرفان و ایقان کے یم ناپیدا کنار سے جا ملی۔ اور اسی دوران میں اس کا جوہرِ طبع سخنوری اور شیوا بیانی کے مراحل سے گزر کر وجدان و الہام کی قدسی رفعتوں پر جا چمکا ۔۔۔ لیکن اس سہارے عملِ ارتقاء میں ایک رشتۂ مشترک اوّل سے لے کر آخر تک برابر قائم رہا اور شاعرِ مشرق کی بیشتر فنی اور الہامی تخلیقات اس سے مربوط اور پیوستہ رہیں۔

میری ناچیز رائے میں یہ رشتۂ مشترک وہ روحِ سخن تھی جو کلامِ اقبال میں حرکت اور حرارت بن کر ابتداء ہی سے داخل ہوئی اور مرورِ ایام اور فروغِ فکر کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتی ہوئی اس حد تک ترقی کر گئی کہ بالآخر شاعر کے سارے عرصۂ سخن پر محیط ہو گئی۔ حرارت اور حرکت کا یہ عنصر مخلوط اگر آپ ذرا غور فرمائیں، تو شعرِ اقبال کا اہم ترین اور عظیم ترین عنصر ہے۔ اور اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ اقبال کی شاعری کا حسن و امتیاز اور اس کے پیغام کی سطوت و صولت اسی کے جمال سے مستنیر اور اسی کی قوت سے آفاق گیر ہے۔

یہ بات کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں کہ ہم نے اپنی شاعرانہ روایات عجم سے ورثے میں پائی ہیں اور اگرچہ ہمارے اکابرِ سخن میں سے ہر بلند پایہ شاعر اپنا ایک مخصوص اندازِ فکر اور ایک ممتاز اسلوبِ اظہار رکھتا ہے لیکن جہاں تک روایات کا تعلق ہے اور اس تعلق اور اس کے تاثرات سے انکار کرنا محالات میں سے ہے۔ شعرِ عجم کی شگفتگی و شادابی، رعنائی و زیبائی اور سرمستی و دلکشائی کے خزانہ عامرہ سے ہر صاحبِ فن نے باندازۂ ہمت و بقدرِ شوق حصہ پایا۔ اقبالؔ بھی ان اکابر میں شامل تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعرِ عجم کا وہ سرمایۂ آتشیں کہ ہزار ہا سال کی آتش و آفتاب پرستی کا نتیجہ تھا، تمام و کمال ظلمت کدۂ ہند کے اسی ایک آتشِ نفس کو منتقل کیا گیا کہ بختِ ملّت کی شبِ تیرہ و تار میں اپنے کاروانِ گم شدہ کی رہنمائی کا سامان بہم پہنچائے، اور اپنی آتش نوائی سے اُن خفتگانِ راہ کو بیدار کر دے جن کی گراں خوابی نشور قیامت کے سوا اور کسی ہنگامے کی منتظر نہیں تھی۔

لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شعرِ عجم کا سوز محض ایک انفعالی کیفیت رکھتا تھا، فعالی خصوصیات سے قطعاً ناآشنا تھا۔ وہ دل کو گداز تو کر سکتا تھا لیکن ناسازگاریٔ زمانہ پر برق بن کر گرنا اُسے نہیں آتا تھا۔ وہ سینۂ شاعر کو تو روشن کر سکتا تھا لیکن جادۂ کارواں کو مستنیر کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پس اقبالؔ نے مجمرِ عجم سے ایک چنگاری تو ضرور مستعار لی لیکن اُسے اپنی ہی خاکسترِ دل میں

اس انداز سے فروغ دیا کہ جب وہ شعلہ بن کر چمکی تو اس کے نور سے نہ صرف شاعر کی اپنی روح جگمگا اٹھی بلکہ وہ آفاق بھی پرانوار ہو گئے جہاں تک اس کی آتش بیانی کا زیر و بم پہنچ سکتا تھا۔ اقبال کی شعلہ نوائی مشرقی شاعری میں آپ ہی اپنی مثال ہے۔ وہ بہ یک وقت اس سوز کی بھی حامل ہے، جو دل کو گداز بخشتا ہے، اس حرارت کی بھی سرمایہ دار ہے جو خود زندگی کا منبع ہے اور اس روشنی کی بھی امین ہے جو حقیقت کا جلوہ دکھاتی اور صداقت کا راستہ صاف کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل خود ایک پارۂ نور ہے کہ ہر لحظہ اس نور الانوار سے کہ زبانِ قرآن میں نور السموٰت والارض ہے، کسبِ ضیا کرتا اور پھر اس ضیاء کو اس انداز سے منتشر کرتا ہے کہ اس تیرہ خاکداں کی دھند، خنکی اور ظلمت ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہوئی ابد کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

حرکت، حرارت کی ہمزاد ہے اور حکمتِ جدیدہ کے نزدیک زندگی کی یہ دونوں کیفیتیں بیک وقت ایک دوسرے کی خالق بھی ہیں اور مخلوق بھی۔ حرارت حرکت کو جنم دیتی ہے اور پھر خود اس سے جنم لیتی ہے زندگی کے ان اولین اور بنیادی مظاہر کے اس رشتۂ باہم کا یہ ایک فطری نتیجہ تھا کہ ذہنِ شاعر میں بھی ان کی نمود اور فروغ ایک ہی تحریک کے تابع ہو۔ چنانچہ شعرِ اقبال میں حرارت کی مختلف کیفیتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں حرکت کی متنوع صورتیں بھی پہلو بہ پہلو ملتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ

ہماری شاعری کی روایات حرکت کے تصوّر سے قریب قریب محروم ہیں۔ اور شعرِ عجم میں فردوسی کے سوا حرکت کا بہت کم سراغ ملتا ہے لیکن نوائے عجم کی اس کمی کو سرودِ عرب پورا کر دیتا ہے اور شاعر کی روح کے تار اکثر اس مضراب کی چوٹ سے جھنجھنا اٹھتے ہیں، جیسے غیر مرئی ہونے کے باوجود غیر حقیقی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کیفیت کا اظہار خود شاعر نے ایک جگہ یوں کیا ہے ؎

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اور پھر ایک جگہ اس طرح کہ ؎

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

اس میں کوئی کلام نہیں کہ شعرِ اقبال میں ظاہری طور پر عربی اثرات کا کوئی نمایاں سراغ نہیں ملتا لیکن عربی شاعری کی وہ روح یقیناً اس میں جاری و ساری نظر آتی ہے جو حرکت ہی کا دوسرا نام ہے۔ عرب کا بادیہ نشین شاعر جس کی زندگی صبا رفتار گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر برق رفتار غزالوں کے تعاقب میں بسر ہوتی تھی اور جس کا گھر ایک خیمۂ بے نشاں اور جس کا حجلہ ایک شغدفِ رواں ہوتا تھا، اگر اس کا شعر سر تا سر حرکت نہ ہوتا تو یقیناً وہ زندگی سے محروم رہتا اور شعر کہلانے کا حقدار نہ ٹھہرتا، چنانچہ فطری طور پر عرب کی صحرائی شاعری، کہ یہی اس کی

حقیقی شاعری ہے، حرکت کی شاعری ہے، یہ سچ ہے کہ اقبالؔ اس سے اس انداز میں متاثر نہیں ہوا، جس انداز میں وہ عجم کی شاعری اور اس کی روایات سے ہوا۔ لیکن عربی شاعری کی روح نے اسے بدرجۂ غایت متاثر کیا اور اس کے شعر میں حرکت کے نفوذ کا باعث ہوئی۔

عرب کو حرارت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے وطن کی زمین اور آسمان دونوں گرم تھے اسے ٹھنڈے چشموں اور خنک سایوں کی تلاش رہتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی جنت کو سرد اور دوزخ کو گرم بنایا۔ اس کے خلاف ایران کے وہ خطے جن میں اس کے شعرا کی اکثریت نے فروغ پایا۔ نہ صرف سرسبز و شاداب بلکہ زمستان میں انتہائی سرد اور یخ بستہ بھی تھے اس لئے حرارت دوستی اور آتش و آفتاب پرستی نے رواج پایا اور اپنے اثرات شعر و فن کی روایات پر مرتسم کئے۔

اقبالؔ کے ہاں ہمیں ان دونوں روایات کا ایک لطیف امتزاج ملتا ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس نے روایت کی انفعالی کیفیت میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکی اور سخن کو شاعر کے کلبۂ احزاں سے نکال کر بہارستان عمل میں آباد کیا۔ چنانچہ جس طرح شعر عجم کے سوزِ دروں کو شاعر مشرق نے فروغِ نو دے کر سرچشمۂ حیات ملی بنا دیا، اسی طرح شعر عرب کی روایاتی تب و تاب کو اپنے سخن میں سمو کر اس

قوت سے ملا دیا۔ جو اس عالم ہست و بود میں نیابتِ الٰہی کی سزاوار ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

آپ نے دیکھا، آہنگ وہی رزمیہ عرب کا ہے، لیکن حرکت مقامی کو توسیعِ آفاقی اور جذبۂ انفرادی کو فروغِ اجتماعی دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔

موجودہ مقالے کی ضروریات کے لئے جب میں نے کل شب مجموعۂ اقبال پر ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالی تو میرا خیال تھا کہ میں اس میں سے دس بیس مثالیں اپنے اس نظریئے کی توضیح کے لئے آسانی سے انتخاب کر لوں گا کہ از بسکہ شعرِ اقبال زندگی کی تفسیر ہے اور زندگی نام ہے ان عناصرِ دوگانہ کا جنہیں حرکت اور حرارت کہتے ہیں۔ اس لئے ایک حسین اتفاق سے یہی دو عناصر اس کے شعر کے بنیادی عناصر بھی ہیں۔ اس حقیقت کو اس طرح بھی پیش کر سکتے ہیں کہ از بسکہ زندگی عبارت ہے حرکت و حرارت سے اور یہی دو قوتیں شاعرِ مشرق کے کلام و پیام میں بڑی شدت اور کثرت سے جلوہ آرام ہیں۔ اس لئے لا محالہ شاعرِ مشرق کا کلام نہ صرف زندگی کی

حقیقی تفسیر بلکہ خواب زندگی کی سچی تعبیر بھی ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنا میرے موضوع میں داخل نہیں۔ اگرچہ کلامِ اقبال میں سے حرکت و حرارت کے نظائر تلاش کر کے پیش کرنا میرا فرض تھا۔ چنانچہ جب میں نے چند مثالوں کے انتخاب کے لئے کلامِ اقبال کا سرسری جائزہ لینا چاہا تو آپ یقین جانیئے پہلی ہی کوشش میں میرے ہاتھ شل اور میری نگاہ منجمد ہو کر رہ گئی کلامِ اقبال کا قریباً ہر شعر اس کے پیامِ حرکت و حرارت کے کسی نہ کسی پہلو کا حامل اور امین ہے۔ اقبال نے اپنی زندگی میں کم و بیش پچیس ہزار اشعار کہے ہیں۔ کلامِ اقبال کا مجموعہ ہر جگہ دستیاب ہے اگر کسی کو خدا فرصت اور توفیق دے تو وہ شمار کر کے دیکھ لے، کم از کم بیس ہزار اشعار ایسے ضرور نکلیں گے، جو اس کے کلام میں حرکت و حرارت کی صدہا کیفیات کے آئینہ دار ہوں گے۔ تعجب ہے کہ کسی صاحبِ ذوق و نظر نے پیامِ اقبال کی اس حقیقت بے مثال پر کوئی مستقل کتاب آج تک نہیں لکھی حالانکہ بعض پیش پا افتادہ باتوں پر خونِ جگر یا اس کا کوئی ارزاں بدل بڑی فراخ دلی سے صرف کیا گیا ہے۔

اب اس سے قبل کہ میں آپ کے سامنے کلامِ اقبال میں مجبوراً چند مثالیں پیش کر کے آپ سے رخصت چاہوں اور اپنے اس خواب کو خواب ہی رہنے دوں۔ جو کثرتِ تعبیر کے باعث پریشان ہو کر رہ گیا ہے، میں آپ کی توجہ ایک چھوٹے سے نکتے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اقبال نے اپنے جزء تصورات کو مجسم کر کے بار بار اپنے کلام میں پیش کیا ہے

وہ بھی انہی دو عناصر یعنی حرکت و حرارت کے علیحدہ علیحدہ یا مشترک مجسمات ہیں اور انہی کی مثبت یا منفی کیفیات سے ربط شدید رکھتے ہیں مثلاً اقبالؔ کا محبوب پرندہ شاہین ہے جو بیک وقت حرکت اور حرارت کی دوگونہ صفات سے متصف ہے۔

شاہین کا تصور اقبالؔ کے ہاں سخت کوشی، بلند پروازی، گرمیٔ عمل اور رفعت پسندی کا مجسم تصور ہے اور اسے اس نے قوم کے نوجوان کے سامنے بار بار نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ شاہین کے ضمن میں لہو کا بالتکرار ذکر آیا ہے تو لہو کی بات بھی سن لیجئے۔ لہو یا خونِ گرم اقبالؔ کا ایک مجسّم تصور ہے جو اس کے کلام میں اکثر و بیشتر ہمارے سامنے آتا ہے اور اب ذرا غور کیجئے لہو میں گرمی بھی ہے اور روانی بھی۔ وہی حرکت و حرارت، وہی حرکت و حرارت ؎

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
جسے ملا یہ متاعِ گراں بہا اس کو
نہ سیم و زر سے محبّت ہے نے غمِ افلاس

لہو سے ذہن، نسبتِ رنگ کے باعث، معاً گلِ لالہ کی طرف منتقل ہوتا ہے، لالہ اقبالؔ کا محبوب پھول ہے اور اس کثرت سے اس کے خیابان سخن میں کھلا ہے کہ عرصۂ سخن پر لالہ زار کا گمان ہوتا ہے اور لالہ اقبالؔ کے نزدیک حرارتِ زندگی کا زمینی مظہر ہے جس طرح

شفق اس کا آسمانی منظر ہے

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن، ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی
اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو!
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

غور کیجئے سات اشعار کے اس رقصاں اور مترنم مجموعے میں حرکت و حرارت کے ساتھ مختلف تصورات ہیں۔ ہوا نے صحرا میں گل لالہ کی، کہ خود شعلۂ سینا کی صورتِ روئیدہ ہے، اپنی منزل کی تلاش کی سرگردانی اور جذبۂ پیدائی کی تسکین کے لئے سینۂ زمین سے رونمائی، پھر اس

موجِ ناکام کی نارسائی کہ ضعفِ حرکت کے باعث ساحل کے تصادم سے محروم رہی پھر تماشا گاہِ عالم میں آدم کی گرمئی کار اس کی نیرنگیاں اور نظر فریبیاں اور آخر میں وہی خالص عربی فضائے شعر۔ بادِ بیابانی کی دل سوزی و سرمستی سے شاعر کا اکتسابِ فیض۔

موجِ دریا اور بادِ صحرا کی جولانیوں سے نگاہ ہٹائیں تو ہوائے شام میں اقبال کا ایک اور تصوّر مجسم رقصاں نظر آتا ہے۔ یہ کرمکِ شبِ تاب ہے اور آپ تعجّب فرمائیں گے کہ اس ایک حقیر کیڑے پر کلامِ اقبال میں پوری پانچ نظمیں موجود ہیں جو اس کی تابانی اور نور افشانی اور تجسیمِ نور کی توضیح و تفسیر کرتی ہیں ؎

یک ذرہ بے مایہ متاعِ نفس اندوخت
شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

وا ماندہ شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شد
از سوزِ حیات است کہ کارش ہمہ زر شد
دارائے نظر شد

پروانۂ بے تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد
ز شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترکِ من و تو کرد

یا اختر کہ ماہ جبینے بہ کمینے
نزدیک تر آمد بہ تماشائے زمینے
از چرخ برینے
یا ماہِ تنک ضو کہ بہ یک جلوہ تمام است
ماہے کہ بہ دریوزنِ خورشید حرامست
آزادِ مقام است

میں نے شعرِ اقبال میں تصوّرات مجسم کا یہ قدرے تفصیلی ذکر دو وجوہ سے کیا ہے۔ پہلی وجہ تو اس امر کا اظہار ہے کہ اقبال نے اپنے نگار خانۂ سخن میں جتنے تصوّرات کو مجسم کیا ہے وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ بلند ہوں یا پست، عظیم ہوں یا حقیر، وہ سب کے سب حرارت یا حرکت یا ان دونوں عناصر کے مشترک مظاہر ہیں۔ دوسری غرض اس تفصیل سے یہ ہے کہ حرکت و حرارت کے مظاہر میں سے اقبال نے کسی ایک کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا کہ وہ فرومایہ حقیر ہے، جہاں کہیں اسے اپنے پیام زندگی کے ابلاغ کا موقع ملا ہے وہاں اس نے مہر عالم تاب اور کرمکِ شب تاب میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی اور موجۂ دریا اور لالۂ صحرا کو یکساں طور پر وسیلۂ اظہار اور ذریعۂ اثبات بنایا ہے۔ مستزاد اس پر یہ کہ حرکت و حرارت کے مظاہر کے سوا اسے کوئی اور تصورِ مجسم ہاتھ نہیں لگا جس سے وہ اپنے تصویر محل کی رونق میں اضافہ کر سکتا ہے۔ اس میں شاعر کے عجز کو دخل نہیں، بلکہ یہ محض اس کی

صدا بدید کا کرشمہ ہے۔ اور اب چند بکھری ہوئی مثالیں اس موقعے پر اقبالؔ کے طالب علموں کے سامنے اس کے کلام کے بلبیوں مقامات ابھریں گے مگر میں محض چند ایسے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جو چنداں پیش پا افتادہ نہیں۔ اس لئے ایک کیفیتِ ندرت لئے ہوتے ہیں۔

بانگِ درا اقبالؔ کا پہلا مجموعہ ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بجائے خود ایک پیغامِ رحیل ہے۔ اس میں اقبالؔ کا وہ معرکہ آرا مرثیہ شامل ہے جس کا عنوان ہے "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" مرثیے کی دلدوز اور الم ناک فضا میں بظاہر حرکت و حرارت کی موجودگی کے بہت کم امکانات نظر آتے ہیں۔ لیکن ذرا دیکھئے ؎

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہے

سردیِ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں
پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے بادِ صبحدم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

اس عالمِ ہست و بود کی مختلف منازل میں سے موت کا مقام ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان بالکل بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ اور موت کا پنجۂ آہنیں اس کے ارادوں اور عزائم اس

کی تمناؤں اور امیدوں اور اس کے حوصلہ و وقار کو اپنی گرفت میں لے کر کچلنا چور کر دیتا ہے۔ لیکن دیکھیئے اس مقام پر پہنچ کر بھی شاعر مشرق اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا اور اپنی ماں کے مرقد پر وہ سرنگوں نہیں ہوتا، بلکہ افقِ خاور کی طرف دیکھتا ہے اور زندگی کی ایک نئی صبح کو خوش آمدید کہتا اور خود زندگی کی نمود و درخشانی کا پیغام جاوداں دیتا ہے۔ اکتساب و انتشار نور اور تحریک و توسیع زندگی کی اس سے خوب تر مثال دنیا کی ادبیات عالیہ میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ اور اب ایک اور منظرِ جمیل دیکھیے۔

طلوعِ اسلام

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

اور اب ساقی نامہ کے چند شعر سنا کر آپ سے رخصت ہوتا ہوں. یقین ہے کہ آپ اس کے زیر و بم کو حرکت و حرارت کی آمیزش نادر سے ہم آہنگ پائیں گے۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — ارم بن گیا دامنِ کوہسار
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

وہ جوئے کہستاں اچکتی چلی اٹکتی لچکتی سرکتی چلی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل
اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے
زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
دلِ طورِ سینا و فاران دو نیم تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ، سوزِ صدیق دے

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ نظر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

دما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر تڑپنے میں لذت اُسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اُسے

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس
زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

اور اب چلتے چلتے ایک لطیفہ سن لیجئے۔ اقبالؔ کو جو دشمنی خنکی اور دوستی حرارت سے تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی جنت کو ایک ہنگامہ زار اور اپنے جہنم کو ایک سرد خانۂ تاریک کی صورت عطا کرے چنانچہ وہ اپنی سیرِ فلک، کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں ؎

کیا سناؤں تمہیں ارم کیا ہے — خاتم آرزوئے دیدہ و گوش
شاخِ طوبے پہ نغمہ ریز طیور — بے حجابانہ حور جلوہ فروش
ساقیانِ جمیل جام بدست — پینے والوں میں شورِ نوشا نوش

دور جنت سے آنکھ نے دیکھا
ایک تاریک خانہ سرد و خموش
طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ
اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر
کرۂ زمہریر ہو روپوش
میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی
حیرت انگیز تھا جوابِ سروش
یہ مقام خنک جہنم ہے
نار سے، نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے
جن سے لرزاں ہیں مرد عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

اقبالؔ کا تغزّل

انیسویں صدی کے آخر میں جب نوجوان اقبالؔ نے شعر کہنا شروع کیا تو شاعری کی دنیا میں داغؔ اور امیرؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ غالبؔ کو بھی کسی نے پہچانا نہیں تھا۔ اور حالیؔ اور آزادؔ کو قومی اور نیچرل شاعری کو ملک کے نوجوان شعرا کے طبقے میں وہ قبول حاصل نہیں ہوا تھا، جو آگے چل کر بیسویں صدی کے پہلے دس سال ہی حاصل ہوا۔

اس مذاق کو پھیلانے اور موزوں طبائع کو اس سے متأثر کرنے میں رسالہ مخزن کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جسے ۱۹۰۱ء میں سر عبدالقادر مرحوم نے جاری کیا۔ اقبالؔ کی پہلی نظم ہمالہ اسی مجلّے میں اولیں شمارے میں شائع ہوئی اور نوجوان شعرا کے سمندِ طبع پر تازیانے کا کام کر گئی۔

مخزن کے اجرا سے پہلے جو رسائل اطراف و اکنافِ ملک میں جاری

تھے وہ گلدستوں کی کیفیت رکھتے تھے۔ اور ان میں محض غزلیں ہی شائع ہوتی تھیں۔ اور اس طرح ملک بھر کے شعراء کو اساتذۂ وقت کی تقلید میں غزلیں کہنے اور انہیں پرکھنے کا موقع ملتا تھا۔

غزلیہ مشاعروں کا بھی عام رواج تھا۔ اور شمالی ہند کے تقریباً ہر بڑے شہر میں جن میں لاہور بھی شامل تھا۔ چھوٹے بڑے مشاعرے باقاعدگی سے منعقد ہوا کرتے تھے۔ لاہور میں ایک ایسی ہی مجلسِ مشاعرہ بھاٹی دروازے کے اندر لاہور کے مشہور فقیر اور حکیم خاندانوں کی ادبی سرگرمیوں کی بدولت قائم تھی اور ہر دسویں پندرھویں دن اس میں شہر کے چند خوش مذاق لوگ جمع ہو کر دادِ سخن دیتے اور فن کا چراغ روشن کرتے تھے۔

حضرت علامہ بھی بارہا ان مجالس میں شامل ہوتے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ ان کا اس زمانے کا کلام زیادہ تر غزلیات ہی پر مشتمل ہے اور ان کیفیتوں کا آئینہ دار ہے جو شاعر کے گرد و پیش بلکہ خود اس کے دل کی دنیا میں کارفرما تھیں۔

زبان و بیان کے اعتبار سے وہ ان دنوں داغؔ اور امیرؔ سے بہت متاثر تھے۔ امیرؔ کی نسبت وہ اپنے ایک مقطعے میں کہتے ہیں کہ ؎

عجیب سے ہے صنم خانۂ امیرؔ اقبالؔ
میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

اور داغؔ سے تو انہیں ایک نوع کا تلمذ بھی تھا۔ وہ اس کے بیان جذبات کے انداز کے بدرجۂ غایت قائل تھے۔ چنانچہ ان کے مرثیہ داغؔ

کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں کہ ؎

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تصویریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

داغ کے انداز میں انہوں نے متعدد غزلیں بھی کہیں، جن میں سے بعض غزلیں اب ان کے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہیں ان میں، وہ غزل خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے جس کا ایک شعر ہے کہ ؎

مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ اس کے
فلک کیا ہے کسی معشوق بے پردا کی ڈولی ہے

لیکن یہ غزلیں اب نایاب ہیں، ان کے موجودہ مجموعۂ کلام میں ان کے اس اولین اندازِ سخن کی نمائندگی جو غزلیں کرتی ہیں ان میں سے یہ غزل ملاحظہ فرمایئے ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو نہاں کو آنے میں قاصد
مگر یہ بنا طرزِ انکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

اس غزل میں جذبات کی سادگی کے ساتھ بیان کی شوخی اور اظہار کا تیکھا پن ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ کلامِ اقبال کی نمایاں خصوصیت، یعنی ندرتِ خیال اور ثروتِ معانی اس زمانے میں کسی طور بیان کی نزاکتوں سے مغلوب ہو کر رہ گئی تھی ہر گز نہیں، اس دور میں بھی ان کا وجدانِ شعر کیف کی بلندیوں پر تھا۔ اور ان کے خامۂ گہر ریز سے اس طور کے اشعار بھی نکلتے چلے جا رہے تھے ے

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کر بھلا طُور پر کلیم!
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

اقبالؔ اپنی غزل گوئی کے دورِ اول میں جسے ہم داخلی کیفیات کا دور کہہ سکتے ہیں، بڑی سرعت کے ساتھ ان مقامات کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ جہاں ان کے رفیقانِ سفر کی نگاہیں بھی نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ چنانچہ بیان کی اس سادگی کے ساتھ جوان کے اس دورِ شاعری کی امتیازی خصوصیت تھی۔ معانی کی جن حسین کیفیتوں کو انہوں نے جالیا، ان کا ایک ہلکا سا پرتو اس نوع کے اشعار میں ملتا ہے ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلےٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

آپ نے دیکھا، وہ روایتی معاملہ بندی اور حسن پرستی جس سے

داغ و امیر کے تتبع میں ان کی غزل نگاری کا آغاز ہوا تھا، اب ان کے کاروانِ سخن کی گردِ راہ ہو کر رہ گئی ہے اور وہ سوزِ دل اور معرفتِ نفس کی اس غزل میں داخل ہو چکے ہیں، جو حقیقت میں ان کا مقصود تھی۔ یہاں پہنچ کر ہم واضح طور پر اس کیفیتِ بے تابی و خود شناسی کا نو احساس کرنے لگتے ہیں۔ جو آگے چل کر ان کے سخن کی جان اور ان کے پیغام کی روح بننے والی تھی۔

لیکن ابھی ان کے شعر میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو شاعر کی انفرادیت کو ملّت کی اجتماعیت میں گم کرنے والی اور اس کی دنیائے دل کی حدود کو آفاق کے ڈانڈوں سے ملا دینے والی تھی۔

اس کیفیت سے ہم پہلی بار ان کی اس معرکہ آرا غزل میں آشنا ہوتے ہیں جو انہوں نے اپنے پہلے قیام فرنگ کے دوران میں کہی اور اسی زمانے میں مخزن کے ذریعے سے شائع ہو کر خیال افروز ملّت ہوئی۔ یہ غزل درحقیقت اقبال کی شاعری میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے اور اُن کی مینائے سخن میں صہبائے ملت کی رنگینیوں کی پہلی جھلک پیش کرتی ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہوگا
سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا۔ پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

اقبال کی غزلیہ شاعری کے ارتقا میں اس غزل کی کیفیت ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ یہاں سے ان کی غزل کا دور شروع ہوتا ہے جو اس کا سب سے بلند اور سب سے تابناک دور ہے اس دور کی غزلیات نے جہاں ایک طرف یہ ثابت کیا کہ غالب کا وہ قول اقبال کے اعجازِ سخن سے محروم حقیقت ہو گیا ہے کہ ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل

وہاں اس نے اس حقیقت کو بھی روشن تر کیا کہ غزل محض عورت کے حسن کی توصیف اور اس کے وصال و فراق کی کیفیتوں کے بیان ہی کے لئے وقف نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتیں آفاق گیر اور اس کی لطافتیں بے کراں ہیں۔ اور شاعر اگر چاہے تو کائنات کے حسن، فطرت کے جمال، زندگی کے بلند و پست اور ماورائے زندگی کے خوب و زشت کو اس کے آئینہ ہزار رنگ میں منعکس کر سکتا ہے۔ اور اس کے باوجود غزل کا وہ کیف و جذب بھی قائم رکھ سکتا ہے جو محض ذکر محبوب و محبوبی سے خاص سمجھا جاتا ہے۔ بال جبریل کی اکثر و بیشتر غزلیں اقبال کے اس اعجاز تغزل کی کامیاب مثالیں ہیں۔ ان کے دامن میں احساسِ شاعرانہ کی مثالیں ہیں۔ ان کے دامن میں احساسِ شاعرانہ کی نازک ترین کیفیتیں فکرِ حکیمانہ کی بلند ترین رفعتوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں اور شعرِ اقبال کے طالب علموں کو ان بلندیوں کی طرف لے اڑتی ہے جو ثریا کی ہمسر اور طوبیٰ کی ہمسایہ ہیں۔ دیکھئے ؎

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے، نم ناک نہیں ہے
کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے
عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

شاعرِ مشرق نے اپنی غزل میں جو حیات افروز پیغام انسانیت کو دیا ذرا اس کا مقابلہ اس مریضانہ کیفیت سے کیجئے جو آج سے پچاس برس پہلے کی روایتی غزل اور پھر اس سے سو برس پہلے کے غم ناک مرثیۂ زندگی میں جاری و ساری تھی۔ اور پھر فکر و نظر کی ان مسافتوں کا اندازہ لگائیے جو اقبالؔ کے وجدان و حکمت نے ایک ہی طویل جست میں طے کر ڈالیں مگر یہ مقام اور یہ مرتبہ ہر کسی کو ارزانی نہیں ہوتا۔ دورِ آسمان نے آج تک ایک ہی غالبؔ اور ایک ہی اقبالؔ پیدا کیا ہے ؎

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی
نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

غزل کا دوسرا دور

پھر یادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو گل ہے تو گلستاں ہو

پہلی جنگِ عظیم سے پہلے اقبال کی غزل نگاری میں وہ بیشتر عناصر ابھر کر تکمیل پا چکے تھے جو غزل کے مروجہ اسالیب سے مطابقت رکھتے تھے۔ اقبال نے اساتذہ کے تتبع میں بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ لیکن اس دور کے اساتذہ مثلاً امیر اور داغ کے رنگ میں جو غزلیں انہوں نے کہیں وہ کسی اعتبار سے بھی ان اساتذہ کی ہم زمین غزلوں سے کمتر نہیں نہیں۔ بلکہ اہل ذوق آج بھی ان میں اقبال کا منفرد رنگ جھلکتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن اقبال کی شاعری کے اوّلین دور کا کارنامہ ان کی قومی اور ملی شاعری ہے۔ غزلیہ شاعری نہیں۔ اگرچہ اس میں

کوئی کلام نہیں کہ اس دور کے آخر کی بعض غزلیں ہمارے شعری ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں اور اس انقلابی رجحان کی آئینہ دار ہیں جو ضمیر شاعر میں پرورش پا رہا تھا اور ذرا آگے چل کر اس کی غزلیہ شاعری پر اثر انداز ہونے والا تھا۔ مثلاً اقبالؔ کی وہ غزل جس کا مطلع ہے کہ ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز پھر آشکار ہوگا

یا پھر وہ مشہور غزل جو اسی طرح شروع ہوتی ہے کہ ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ غزلیں بلاشبہ شاعر کے اندازِ فکر اور طرزِ اظہار دونوں کی بدلتی ہوئی کیفیت اور ان کے عظیم مستقبل کی طرف ایک واضح اشارہ کرتی ہیں اور جن لوگوں کو اقبالؔ کی زندگی کے اس دور میں اس کے کلام کے مطالعے کا موقع ملا تھا ان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اقبالؔ کی نظم کی طرح اس کی غزل بھی نامعلوم اور اچھوتی بلندیوں کو چھونے والی ہے۔

اقبالؔ کے اس کلام میں جو جنگ عظیم سے پہلے طبع ہوا غزل کا حصہ بہت کم ہے اور دوسری اصنافِ سخن سے دبا ہوا ہے۔ جنگ کے دوران میں اس کی توجہ مثنوی کی طرف مائل ہوئی اور اسرار و رموز معرضِ وجود میں آئیں۔ اس اثنا میں ان کے وسیلۂ اظہار پر فارسی نے تسلط پا لیا تھا اور فکر پر رومیؔ غالب آ چکا تھا۔ رومیؔ نے فارسی شاعری کو عشق ایک آفاق گیر تصوّر دیا تھا یہ

تصور اقبال کے ہاں آ کر اور نکھرا اور فقر اور ایمان کے حیات افروز اور زندگی بخش تصورات سے مل کر ان کے کلام میں رونما ہوا۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے بعد اقبال کا سفینۂ سخن از سرِ نو تنگنائے غزل میں داخل ہو چکا تھا اور علم و عرفاں کی بے کراں وسعتوں میں گم ہو جانے کے لئے سراپا اضطراب تھا چنانچہ اس دور میں پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کی فارسی غزلیات اور بالِ جبریل کی اردو غزلیں معرضِ وجود میں آئیں ہاں غزل کے ایک نئے عہد کی آفرینش کا باعث ہوئیں۔

فارسی میں نور رومی، عرفی اور سنائی کے ہاں ہمیں عشق و فقر کے ان تصورات کے بدیہی نشانات ملتے ہیں جو بیسویں صدی میں اقبال کے کلام میں فروغ پذیر ہوئے لیکن اردو میں ان تصورات کی نمود ایک قطعاً نئی یافت تھی اور ان کو اظہار کا جامہ پہنانے میں اقبال نے الفاظ کی جس نئی ترتیب سے کام لیا وہ بہ یک وقت حیرت انگیز اور روح افروز ہے۔ ہمارے ہاں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بحث تو چلتی تھی لیکن حقیقت پر بھی ہمیشہ مجاز ہی کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ غالب اور میر درد کے بعض اشعار کو چھوڑ کر ہماری کلاسیکی شاعری میں بھی اشعار کا کوئی ایسا قابلِ ذکر ذخیرہ نہیں ملتا۔ جسے ہم عشق و عاشقی کے مروجہ مفہوم سے الگ ہو کر دیکھ سکیں۔ یا جو کاروبارِ عشق کے روزمرہ سے جدا ہو کر ہمیں ایک ایسی فضا کی طرف لے اڑے جہاں قلب کا گداز اور نظر کی تسکین دونوں میسر ہوں اور بہ افراط میسر ہوں۔

شعرِ اقبال کے دورِ ثانی کی غزل میں یہ فضا اپنی پوری وسعت اور

تمام تر پہنائیوں کے ساتھ موجود ہے اور ان کے فکر جدید کے تینوں عناصر یعنی عشق، فقر اور ایمان سے معمور ہے ؂

دل سوز سے خالی ہے نظر پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے
کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے
کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے
بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے
عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بالِ جبریل کی غزل میں اقبال کا فکرِ حکیمانہ اس کے اظہارِ شاعرانہ پہ چھا گیا ہے اور وہ طالب جس کے کانوں میں بانگِ درا کے نغمے گونج رہے ہوں، بالِ جبریل کے پُرعظمت آہنگ سے یک بیک مانوس نہیں ہو پاتا، لیکن یہ خیال چنداں صحیح نہیں۔ بالِ جبریل ایک تختۂ گل ہے جس میں لالہ کے ساتھ سمن اور نیلوفر کے پھول بھی کھل رہے ہیں

ہیں۔ اور اگرچہ مغزِ سخن سر بسر ایک ہے، پیرایۂ سخن بڑے دل آویز انداز میں بدلتا اور ہر نوع کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔ مثلاً اقبال کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔ جہاں فکر و نظر نے اپنے لئے ایک بڑا پیارا اور ہلکا لباس منتخب کیا ہے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن
من کی دنیا، من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا، تن کی دنیا سود و سودا، مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اس دور کے فارسی کلام کا بھی یہی انداز ہے۔ پیامِ مشرق کی بیشتر غزلیں فکر و نظر کے اعتبار سے شاعر کے نظریۂ عشق و فقر اور اس کے تصورِ ایمان و خودی کی محکم مثالیں ہیں۔ اور اظہار و بیان کا انداز کبھی حافظ و غالب سے میل کھاتا ہے اور کبھی رومی و عرفی کی یاد دلاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل گدازے
بمتاعِ خود چہ نازی کہ بہ شہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نہ ارزد بہ تبسم ایازے
ہمہ نازِ بے نیازی ہمہ سازِ بے نوائی
دل شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے
ز مقامِ من چہ پرسی بہ طلسمِ دل اسیرم
نہ نشیبِ من نشیبے نہ فرازِ من فرازے
ذرہ تو ناشناسم، ز تغافلِ تو خامم
من و جانِ نیم سوزے، نور چشم نیم سازے
رہ دیر تختۂ گل ز جبیں سجدہ ریزم
کہ نیازِ من نگنجد بدو رکعت نمازے

اور اب ایک اور غزل جو ایمان اور خودی کے تحفظ میں حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک ایمان اور خودی مترادف الفاظ ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ خود شناسی کے بغیر زمانہ شناسی اور خدا شناسی دونوں ناممکن ہیں اور بندۂ خود آگاہ اور بندۂ خدا آگاہ میں کوئی دوری نہیں اور خالق ارض و سما نے بندۂ مولا صفات کو غیر محدود قوتیں بخشی ہیں ؎

موج را از سینۂ دریا گسستن می تواں
بحرِ بے پایاں بجوئے خویش بستن می تواں

از نوائے می تواں یک شہر دل در خوں نشاند
یک چمن گل از نسیمے سینہ خستن می تواں

گر بخود محکم شوی سیل بلا انگیز چیست
مثلِ گوہر در دل دریا نشستن می تواں

من فقیرِ بے نیازم مشربے ایں است و بس
مومیائی خواستن نتواں شکستن می تواں

اور اب چلتے چلتے ایک ایسی اردو غزل سن لیجئے جو روح کے تار دل پر عشق اور فقر کو ہم آہنگ کرتی اور عقل مادہ پرست اور حیلہ غرض مند کو فنا کا راستہ دکھاتی ہے ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہاں گیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ

یا عقل کی روباہی یا عشقِ یدُاللّٰہی
یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ

یا شرعِ مسلمانی یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بُت خانہ

میری میں فقیری میں، شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

اقبالؔ کے کوہ و صحرا

یومِ اقبالؔ ۵۶ء کے جلسۂ لاہور میں پڑھا گیا

اقبالؔ کے جن طالب علموں نے اس کے کلام کا قدرے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ ان پر یہ نکتہ یقیناً آشکار ہوگا کہ اگرچہ اس کی شاعری کے حصّہ غالب پر اس کی فکرِ حکیمانہ مسلط ہے اور ہر چند کہ اس کی آہ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی اس کے سوزِ دروں ہی سے مستعار ہے۔ لیکن فکر و حکمت کے ان نقوش اور درد و سوز کے ان مرقعوں میں جو اس کی آگہی، اس کی دانش، اس کی یافت اور اس کی تپش کے سرمایہ دار ہیں جو شوخ و دل آویز رنگ اس کی فن کاری نے بھرے ہیں۔ وہ یقیناً اسی لازوال خزانے سے حاصل کیے گئے ہیں، جسے عروسِ فطرت اپنے دامنِ رنگیں میں چھپا چھپا کر رکھتی ہے اور جب کبھی اپنے پرستار پر مہربان ہوتی ہے تو اس کی چشمِ نظارہ جو کہ اس کی ایک جھلک دکھا کر اسے پھر سے اپنے دامن میں

چھپا لیتی ہے۔

اقبالؔ عروس فطرت کے بہت بڑے پرستار تھے اور اگرچہ ان کی یہ پرستاری ان کی فطری بلندیوں کے سائے میں چھپ کر رہ گئی ہے تاہم ایسی بھی پوشیدہ نہیں کہ اُن کے کسی طالبِ صادق کی نگاہ اس پہ پڑے اور جم کر نہ رہ جائے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اس معنی میں فطرت کے شاعر نہیں ہیں جس میں ہمارے ہاں مثلاً انیسؔ و آزادؔ یا جوشؔ و محشرؔ ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ خالص نیچرل شاعری کو ان کے ہاں مقام حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ وہ فطرت اور مظاہرِ فطرت سے بے محابا متاثر ہیں اور ان تاثرات کو جب وہ اپنے قلبی محسوسات میں سمو کر الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں تو دنیائے ظاہر اور دنیائے دل کا یہ اتصال شعر کی ایک نادر کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔

اقبالؔ کی فطرت پرستی ان کے ابتدائی کلام میں زیادہ نمایاں ہے۔ اور فطرت کے جن مظاہر و مناظر سے وہ نہ صرف اس دور میں بلکہ اس کے بعد آنے والے ادوار میں بھی نمایاں طور پہ متاثر ہوئے ہیں۔ اُن میں سحر و شام کے کوہ و صحرا کا درجہ ہے۔ ان کا بچپن ایک ایسے مقام پہ بسر ہوا جہاں مطلع صاف ہو تو ہمالہ کی برف پوش چوٹیاں اور مرصّع ڈھلوانیں صبح و شام نظر آتی ہیں اور احساساتِ طفلی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ننھا اقبالؔ جو مبدا ءِ فیاض سے شاعر کا نزاکتِ احساس لے کر آیا تھا، اپنے وطن کی صبح و شام میں ہمالہ کے مناظر سے بدرجۂ غایت متاثر ہوتا رہا اور

ازبسکہ تاثراتِ طفلی ہی انسان کے سب سے تیکھے اور پائیدار تاثرات کی کیفیت رکھتے ہیں، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان اقبال کی سب سے پہلی نظم اس کے بچپن کے انہی تاثرات کی تصویر ہے اور اس کے شاعرانہ جذبات اور فکری تصوّرات سے مل کر شاعر کے احساس و بیان کا ایک نادر مرقع پیش کرتی ہے ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
نوجواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ، کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پہ تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے کیا غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پہ غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

آپ نے دیکھا، شاعر کوہ کی رفعتوں سے بہ یک جست اپنے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور اسے اپنے افکار کا عکس درختوں پر کانپتا نظر آنے لگتا ہے اور اس کا تصور اور اس کی آرزو اسے اس عہد

میں پہنچا دیتی ہے، جب انسان کی فطرتِ سادہ کو تہذیب نے آلودہ نہیں کیا تھا۔ اور جب وہ آج کی بہ نسبت خدا سے زیادہ قریب تھا۔ اقبالؔ کی فکری کیفیتیں اس کی ابتدائی شاعری میں بھی اس حد تک قوی ہو چکی تھیں کہ مظاہر و مناظر کی خارجی حدود ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ اور طبیعت کے ذرا سے اشارے سے شعر کو فکر و احساس کی غلام گردشوں میں گم کر دیتی تھیں۔

ہمالہ کے بعد کلامِ اقبالؔ میں کوہستان کی حسین کیفیتوں کا دوسرا عکس ہمیں ابرِ کوہسار اور تیسری تصویر ایک آرزو ملتی ہے۔ یہاں بھی مناظر کے لطیف تاثرات جذبات کے لطیف تر مظاہر سے ہم آغوش ہیں، اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شاعر دنیائے دل سے دنیائے گرد و پیش کی طرف گریز کرتا ہے یا جہانِ رنگ و بو سے جہانِ آرزو کی طرف قدم اٹھاتا ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ گریز کی دونوں کیفیتیں جمالِ شعر کی جلوہ سامانیوں سے مالا مال ہیں ؎

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کر دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا میری دکھادے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کی ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلادے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگادے

اور اب اقبالؔ کی شاعری کا وہ مرحلہ آتا ہے جب اس کی فکرِ بلند فراز کوہ سے اتر کر پہلی بار وسعتِ صحرا میں مائل بہ تگ و تاز ہوتی ہے۔ غور کیجئے تو ہر چوٹی کبھی نہ کبھی تسخیر ہو جاتی ہے اور اس تسخیر کے بعد لازم ہو جاتا ہے کہ عمل ہو یا فکر، ذہن ہو یا قدم، اگر اسے آگے بڑھنا ہے تو اسے ممکنات و تصوّرات کے سلسلہ کوہ کے دوسری طرف اترنا ہی ہوگا۔ لیکن یہ زوال و ہبوط قطعی نہیں بلکہ محض اضافی ہے۔ کیونکہ اس کے آگے جو منازل فکر و عمل کو ملتی ہیں وہ صحرا کی منازل ہیں۔ جن کا سلسلہ حدِ نگاہ کے پار تک

برابر بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔

شاعر مشرق کی دنیائے فکر میں صحرا کی نمود ایک ایسے تصور کو جنم دیتی ہے جو اس کی شاعری کی شاہ راہ پر ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ یہیں سے اس کا قافلۂ شعر وطن کی وادیوں سے نکل کر ملت کے ریگ زار میں رواں ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ اس زمانے میں فلسفہ اور قانون کی تعلیم کے لئے انگلستان میں مقیم تھے۔ یہاں وہ پہلی بار مغرب کی جارحانہ وطنیت سے آشنا ہوئے اور اس کا فطری ردِّ عمل ان کی طبیعت پر یہ ہوا کہ ان کی توجہ وطن کی دل کشیوں سے ہٹ کر ملت کی ہمہ گیریوں میں مرکوز ہو گئی۔ ہمالہ نے اپنا دامن صحرائے عرب کی وسعتوں سے بچا کر انہیں سمیٹ لیا۔

شعر اقبال میں سحر کے اس نئے دور کا آغاز اُن کی مشہور غزل سے ہوتا ہے جو انہوں نے انگلستان میں لکھی اور انہی دنوں مخزن کے اوراق میں باصرہ نواز ملت ہوئی ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز پھر آشکار ہو گا
سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر آشکار ہو گا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اب صحرا سے اقبال کی محبت گوناگوں کیفیتیں اختیار کرتی چلی جاتی ہے ایک کیفیت جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ممکناتِ زندگی کی بے حدود وسعتوں پر محیط ہے، جن کے لئے صحرا ایک علامتِ تام کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک دوسری کیفیت اس ذوقِ سفر اور سرعتِ رفتار میں ہے جو صحرا کی کشادگیوں ہی سے خاص ہے۔ ایک تیسری کیفیت اس حرارت کی منظہر ہے، جو صحرا کے آتش ناک سینے سے زندگی بن کر اُبلتی اور صحرائیوں کو پیامِ تگ و تاز دیتی ہے۔

ایک چوتھی کیفیت اس پیامِ حیات افروز میں ہے جو پیمبرِ صحرا نے درماندہ و مایوس انسانیت کو دیا۔ اور ایک پانچویں کیفیت اس کارواں میں ہے، جو صحرا سے نکل کر جادۂ عالم پر رواں ہوا اور اپنے نقوشِ قدم پر تہذیب و تمدن کے بوستاں کھلاتا چلا گیا۔

یہ تمام کیفیتیں رفتہ رفتہ شاعر کے ضمیر میں ابھرتی اور اظہار کا جامہ زیب کرتی چلی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ خود صحرا کا خارجی تصور بھی نکھرتا جاتا ہے۔ صحرا کا ایک دھندلا سا نقشہ آپ ابھی غزل کے آئینے میں دیکھ چکے ہیں۔ اب ایک روشن تر مرقع پیامِ خضر میں ملاحظہ ہو۔

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کی تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اس قطعۂ بے مثال کی شعریت و معنویت اہلِ ذوق و اہلِ دل دونوں کے لئے نشاطِ روح کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن اس سے ذرا آگے بڑھیں تو "بالِ جبریل" میں وہ قطعہ نظر پڑتا ہے، جس کی شاعرانہ کیفیت اور فنی بلندی دنیا بھر کے شعر و ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

ے

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں
سُرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیشِ دوام ہے یہی

اس عیشِ دوام کے احساس کا ذرا اس روایاتی احساس سے مقابلہ کیجئے جو شعرائے عجم نے صحرا کی کیفیتوں سے منسوب کیا ہے۔ عجمی شعراء نے صحرا کو صرف جنون کی پرورش کے لئے اپنے شعر میں استعمال کیا ہے اور یہی روایت فارسی سے اردو نے ورثے میں پائی۔ لیکن اقبالؔ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں صحرا کی صورت میں اپنی آرزوؤں کی تنگ۔ و ناز کے لئے ایک وسعت بے نہایت اور اپنی روح کی تسکین کے لئے ایک خلوتِ بے کنار عطا فرمائی۔ کم و بیش کچھ ایسی ہی صورت کوہ و کہسار کی ہے

عجمی شاعری میں پہاڑ کا زیادہ سے زیادہ استعمال فقط اتنا ہے کہ فرہاد اس سے جوئے شیر لانے کی کوشش میں اپنی زندگی تمام کر دے اور پھر اپنا سر پھوڑ کر مر جائے۔ اُردو میں آکر اس پر محض اتنا الم آفریں اضافہ ہوا ہے ؎

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

لیکن دیکھئے اقبالؔ نے کوہ اور اس کے تصورات سے کیسے عجیب و غریب کام لیا ہے۔ اسے رفعت و سطوت کا پیکر بنا کر اس کی چٹانوں کو قوت کردار کا مظہر قرار دیا۔ اُسے فقر و بے نیازی اور حرکت و حرارت کا ایک مجسمہ شاہین کی صورت میں عطا کیا جو اسی کی چٹانوں پر بسیرا کرتا اور اپنا رزق آسمان کی فضاؤں میں تلاش کرتا ہے۔ شاہین کے سوا اقبالؔ کے مردِ کوہستان کو دیکھئے کہ غیرت و صلابت کا ایک پیکر ہے اور اپنے کردار کی مضبوطی و سختی اپنے کہستانی مسکن ہی سے حاصل کرتا ہے ؎

میرے کہستاں تجھے چھوڑ کے جاؤں کہاں
تیری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک
روزِ ازل ہی سے ہے منزلِ شاہین و چرخ
لالہ و گل سے تہی، نغمۂ بلبل سے پاک

تیرے خم و پیچ میں میری بہشتِ بریں
خاک تیری عنبریں، آب ترا تابناک
باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظِ بدن کے لئے روح کو کروں ہلاک
اے مرے فقرِ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہن چاک چاک

اقبالؔ نے زندگی کو بارہا ایک سفرِ مسلسل سے تشبیہہ دی ہے سفر کو کلامِ اقبالؔ میں جو معنوی حیثیت حاصل ہے وہ ایک علیحدہ اور مستقل توضیح کی طالب ہے۔ لیکن یہاں ہمیں صرف اسی قدر سمجھنا ضروری ہے، کہ اقبالؔ کا تصورِ سفر اس حرکت زندہ و پیہم سے نسبت رکھتا ہے، جس کا مقصود تسخیرِ کائنات ہے۔ وہ اس قسم کے سفر سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں رکھتا جس میں مسافر محض ایک کردار مجہول ہو اور جس کا نقشہ ہمارے ایک شاعر نے یوں کھینچا ہے ؎

جہازِ عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

اقبالؔ کا مسافر ایک ولولۂ تسخیر میں برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور کوہ و صحرا اس کی یلغارِ عظیم کی منازل بن کر رہ جاتے ہیں۔ کوہ زندگی کی امکانی بلندیوں اور صحرا اس کی بے نہایت وسعتوں کی علامت نام ہے اور جب یہ دونوں منازل طے ہو جاتی ہیں تو شاعر اپنی نگاہیں

بے محابا آسمان کی طرف بلند کرتا ہے اور ایک کیف تسخیر میں بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

کوہ وصحرا کی جمالیاتی محسوسات اور ان کے علاماتی تصورات کے علاوہ شاعر مشرق نے کوہ وصحرا سے چند ایسی خلاّق کیفیات بھی منسوب کی ہیں، جن کا تعلق انسان کی سیرت کی نشو ونما اور کردار کے ارتقاء سے ہے اور میرے ناچیز علم کے مطابق شعرائے عالم میں اقبال ہی نے ان کیفیات کو اس انداز میں پیش کیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس منفرد پیش کش سے شعرِ اقبال کے عناصر میں کوہ وصحرا کی اہمیت اور ان کا وقار کس قدر بڑھ جاتا ہے۔

مذکورہ کیفیتوں کا اظہار ان کے کلام میں از اوّل تا آخر جا بجا بکھرا پڑا ہے۔ کہیں منظم قطعات کی صورت میں اور کہیں فردیات کی شکل میں لیکن یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ شاعر ذرا سی خارجی تحریک سے اپنے ان محبوب عناصر کی داخلی کیفیتوں کی طرف فوراً مائل ہو جاتا ہے۔ اور ان کے اظہار میں کسی تامل سے کام نہیں لیتا ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی
دنیا میں محاسب ہے تہذیبِ فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی
یہ حسن و لطافت کیوں وہ قوت و شوکت کیوں
بلبل چمنستانی، شہبازِ بیابانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

پھر فرمایا کہ ؎

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برناؤ پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں
ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں

پھر اشارہ کیا کہ ؎

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

پھر اشارہ کیا کہ ؎

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

پھر فرمایا کہ ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو منزل اپنی آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

پھر ارشاد ہوا کہ ؎

دگر بدشتِ عرب خیمہ زن کہ بزمِ عجم
مئے گزشتہ و جامِ شکستنی دارد

پھر فرمایا کہ ؎

تا ضمیرش رازدانِ فطرت است
مردِ صحرا پاسبانِ فطرت است
سادہ و طبعش عیارِ زشت و خوب
از طلوعش صد ہزار انجم غروب
طبع از بادِ بیاباں کردہ تیز
ناقہ را سر دہ بہ میداں ستیز

مردِ صحرا پختہ تر کن خام را
بر عیارِ خود بزن ایام را

پھر بڈھے بلوچ کی زبان سے یہ نکتہ ارزانی ہوا کہ ؎

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

پھر شاہین کہ اقبالؔ کی قوم کے جوانِ صالح کا تصوّر متشکل ہے۔ اس کی زبان سے ارشاد ہوا کہ ؎

کیا میں نے اس خاک داں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں، نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
اداتیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربت غازیانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

جوانوں کے اسی خونِ گرم سے گرمیٔ کائنات کا وجود باقی ہے اور ؎

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی
اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

حضرت علامہ نے شاہین کی طرح ہماری شاعری کو ایک اور تصوّر متشکل بھی عنایت کیا ہے اور یہ گلِ لالہ ہے جو سوز و حرارت کا مجسم ہے، اور ہوائے صحرا میں لہلہاتا اور اسی کی کیفیاتِ گوناگوں کا اظہار کرتا ہے اس لالۂ صحرا کو شاعر نے لالۂ خیاباں سے بالکل جدا کر دیا ہے اور وہ اس میں اپنے سوزِ دروں اور اپنے مخاطب نوجوان کی حرارت زندگی کی تلاش کرتا اور پالیتا ہے ؎

دل را بہ چمن بردم از بادِ چمن افسرد
میرد بہ خیاباں ہا ایں لالۂ صحرا است

از حرف دل آویزش اسرار حرم پیدا
دی کافرکے دیدم در وادی بطحا مست

پھر ارشاد ہوا کہ ؎

پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ ساز گار نہیں یہ جہانِ گندم و جو

اور آخر میں اسے خود مخاطب فرما کر اس کے مقصد زندگی کہ ایک نکتہ نایاب میں یوں بیان فرمایا کہ ؎

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و دمن ورنہ
تو شعلۂ سینائی میں شعلۂ سینائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی
ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو وہ منظرِ جمیل بھی دکھاتا جب چراغِ لالہ سے کوہ و دمن روشن ہوتے ہیں اور دامنِ صحرا کے پھولوں پر

پریوں کی قطاروں کا گمان گزرتا ہے اور وقت ہوتا تو میں ہمالیہ کی چہیتی بیٹی وادی لولاب کا جمال جہاں آرا دیکھنے کے لئے آپ کے ساتھ چلتا اور وقت ہوتا تو آپ کو دخترِ دہقاں کا وہ گیت بھی سنواتا جو شاعر نے وادی کبیر کی خلوتوں میں سنا اور اس کے سحر میں گم ہو کر کسی اور زمانے کا خواب دیکھا۔ لیکن افسوس کہ یہ حرفِ مجرمانہ حرف ناگفتہ ہی رہے گا۔ اور اب میں آپ سے رخصت چاہوں گا۔

بس چلتے چلتے اقبالؔ کے محبوب نغمۂ صحرا کی ایک لے سناتا جاؤں گا ؎

نغمۂ ساربانِ حجاز

ناقۂ سیّارِ من
آہوئے تاتارِ من
درہم و دینارِ من
اندک و بسیارِ من
تیز ترک گام زن
منزلِ ما دور نیست
در تپشِ آفتاب
غوطہ زنی در سراب
ہم بہ شبِ ماہتاب
تند روی چوں شہاب

چشمِ تو نادیدہ خواب

تیز ترک گامزن

منزلِ ما دور نیست

شام تو اندر یمن

صبح تو اندر قرن

ریگِ درشت وطن

پائے ترا یاسمن

اے چوں غزالِ ختن

تیز ترک گامزن

منزلِ ما دور نیست

اور یہاں ذرا تامل فرما کر غور کیجئے۔ اقبالؔ جس ناقے کا حُدی خواں ہے، جس صحرا کا پرستار ہے، جس کوہ کا شیدائی ہے، اور کوہ و صحرا سے گزر کر جس آسمان کا جویا ہے، کیا یہ سب وہی مظاہر فطرت تو نہیں ہیں، جن کی نسبت خداوند جل و علیٰ نے انسان کو کلماتِ الوہی میں یوں متوجہ فرمایا تھا کہ ؎

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت فذکر انما انت مذکر ط

اور اونٹ کی طرف دیکھ کہ کیسے بنایا گیا ہے اور پھر آسمان کی طرف کہ کیسے اٹھایا گیا اور پھر زمین کی طرف کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔ اور پھر اپنے خداوند کی قدرتِ کاملہ کی یاد دلا کہ تجھے یاد دلانے کے لئے مامور کیا گیا ہے۔

الحمد لمن قدر خیراً و خبالا
والشکر لمن صوّر حسناً و جمالا

اقبالؔ کی صبح و شام

جن صاحبوں نے اقبالؔ کے کلام کا منزل بہ منزل مطالعہ کیا ہے۔ ان سے یہ امر مخفی نہیں ہوگا کہ اگرچہ اپنی چہل سالہ زندگی میں شعرِ اقبالؔ نے کیا بلحاظِ زبان و بیان، اور کیا بہ اعتبار فکر و تصوّر متعدد کیفیتیں اختیار کیں۔ لیکن چند عناصر ایسے بھی ہیں جو آغاز سے لے کر انجام تک اس کی تخلیقات میں مسلسل موجود رہے اور ان کی امتیازی خصوصیات کے سرمایہ دار بنے انہیں میں وہ رشتۂ نور ہے جو اقبالؔ کے طالب علم کو اس کے جگر پاروں میں شروع سے لے کر آخر تک برابر جاری و ساری نظر آتا ہے اور جس کے پرتو سے اس کے ایوانِ سخن کے در و دیوار پیہم چالیس برس تک اس انداز سے جگمگاتے رہے کہ شعرِ مشرق کی جلوہ سامانیوں اور نورِ ازل کی ضیا پاشیوں میں کوئی حدِ فاصل باقی نہ رہی۔

شاعرِ مشرق جس ذاتِ بے ہمتا کا پرستار تھا اس نے خود اپنے لئے نورُ السمٰوٰت والارض کا اسم اعظم تجویز فرما رکھا ہے، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا نہاں خانۂ دل اس نورالانوار سے مستفید نہ ہوتا جس سے کائنات کا ہر گوشہ منوّر ہے اور اس کی چشم جہاں بیں منبع روشن سے کسبِ ضیاء نہ کرتی جو صبحِ ازل سے فروزاں ہے اور شامِ ابد کے بعد بھی بدستور تاباں و درخشاں رہے گا۔ یہ اسی نورالانوار کا پرتو تھا جس نے مشرق کے شاعرِ اعظم کو بیک وقت روشنی کا جویا اور روشنی سراپا بنایا اور اس کے سحر آفریں کلام میں نورِ سحر اور شفق شام کو اس انداز سے انعکاس پذیر کیا کہ رعنائی و زیبائی اس پر ختم ہوئی اقبال کی شعلہ نوائی مشرقی شاعری میں آپ ہی اپنی مثال ہے۔ وہ بیک وقت اس نور کی بھی حامل ہے جو دل کو گداز بخشتا ہے اس حرارت کی بھی سرمایہ دار ہے جو خود زندگی کی خالق ہے اور اس روشنی کی بھی امین ہے جو حقیقت بھی ہے اور صداقت بھی دوسرے لفظوں میں شاعر کا دل خود ایک پارۂ نور ہے۔ ہر لحظہ اس نورالانوار سے جو کہ زبانِ قرآن میں نور السمٰوٰت والارض ہے، کسب ضیاء کرتا اور پھر اس ضیاء کو اس انداز سے منتشر کرتا ہے اور اس بندۂ خاکدان کی دھند، خنکی اور ظلمت ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہوئی ابد کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

روشنی اور حرارت ہمزاد ہیں اور حکمت جدیدہ کے نزدیک حرارت کی انتہا روشنی کی ابتدا ہے۔ اور میری ناچیز رائے میں یہی وہ روح

روح سخن ہے جو کلامِ اقبال میں ابتدا ہی سے داخل ہوئی ۔ اور مرورِ ایام اور فروغِ فکر کے ساتھ ساتھ نشو ونما پاتی ہوئی اس حد تک ترقی کر گئی کہ بالآخر شاعر کے سارے عرصۂ سخن پر محیط ہو گئی ۔ حرارت اور روشنی کا یہ "عنصرِ مخلوط" اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو سفرِ اقبال کا اہم ترین اور عظیم ترین عنصر ہے اور اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ اقبال کی شاعری کا حسن و امتیاز اور اس کے پیغام کی سطوت و صولت اسی کے جمال سے منیر اور اسی کے انتشار سے آفاق گیر ہے ۔

یہ بات کسی صاحبِ فضل سے مخفی نہیں کہ ہم نے اپنی شاعرانہ روایات عجم سے ورثے میں پائی ہیں اور اگرچہ ہمارے اکابر سخن میں سے ہر بلند پایہ شاعر اپنا ایک مخصوص اندازِ فکر اور ایک ممتاز اسلوبِ اظہار رکھتا ہے ۔ لیکن جہاں تک روایات کا تعلق ہے ، اور اس تعلق اور اس کے تاثرات سے انکار کرنا محالات میں سے ہے ۔

شعرِ عجم کی شگفتگی و شادابی ، رعنائی و زیبائی اور سرمستی و دلکشائی کے خزانۂ عامرہ سے ہر صاحبِ فن نے باندازۂ ہمّت و بقدرِ شوق حصّہ پایا ۔ اقبال بھی ان اکابر میں شامل تھے ، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعرِ عجم کا وہ سرمایۂ آتشیں کہ ہزارہا سال کی آتش و آفتاب پرستی کا نتیجہ تھا ۔ تمام و کمال ظلمت کدہ ہند کے اسی آتش نفس کو منتقل کیا گیا کہ بختِ ملّت کی شبِ تیرہ و تار میں اپنے کاروانِ گمشدہ کی رہنمائی کا سامان بہم پہنچائے اور اپنی آتش نوائی سے ان خفتگانِ راہ کو بیدار کر دے ۔ جن کی گراں خوابی

نشورِ قیامت کے سوا کسی ہنگامے کی منتظر نہیں تھی۔

مرشدِ روم نے کہا تھا ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلامِ آفتابم، ہمہ ز آفتاب گویم

اور ظاہر ہے کہ مولانائے روم کا آفتاب خود زرتشت کا آفتاب ہو تو ہو جم و کے کا آفتاب نہیں تھا۔

اقبال اسی آفتاب کائنات سے گائتری زبان میں یوں خطاب کرتے ہیں ؎

اے آفتاب روح و روانِ جہان ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روح رواں ہے شعور ہے
اے آفتاب، ہم کو ضیائے شعور دے
چشم خودی کو اپنی تجلی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیٔ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پرورد گار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تیری
آزادِ قیدِ اول و آخر ضیا تیری

بانگِ درا کی اولیں منظومات سے لے کر ارمغانِ حجاز کی آخری نظموں تک چلے آیئے۔ نور و حرارت کی اثر آفرینیاں اور صبح و شام کی نیرنگیاں آپ کو ہر منزل بلکہ ہر قدم پر جلوہ آرا نظر آئیں گی۔

اقبالؔ اس معنی میں ایک فطرت پرست شاعر نہیں ہے، جس معنی میں ورڈز ورتھ یا شیلےؔ یا کیٹسؔ فطرت کے پرستار ہیں۔ اور نہ اس نے جمالِ فطرت کی اس طرح عکاسی کی ہے جس طرح ہمارے ہاں انیسؔ اور جوشؔ نے کی ہے۔ بلکہ وہ فطرت سے آشنائی کے بعد فوراً انسان کی طرف لوٹتا ہے اور اس کی ہستی اور اس کی مختلف کیفیتوں میں کائنات کو منعکس پاتا ہے۔

مناظر و مظاہر فطرت سے اس کو ایک بڑی گہری دلچسپی ہے۔ لیکن فقط دلچسپی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کی وابستگی اور شیفتگی

کا مرکز فطرت کا شاہکار خود انسان ہے۔ اور وہ فطرت کی تمام رنگینیوں اور دل آویزیوں کو اسی کی ایک نگاہِ غلط انداز کا پرتو قرار دیتا ہے۔ لیکن فطرت کے تمام مظاہر میں صبح و شام کی کیفیات و تاثرات کا یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ وہ اس کی توجہ پر ایک علیحدہ اور امتیازی حق بھی رکھتے ہیں۔ سحر اس کی تلاشِ نور کی ایک یافتِ عظیم اور اس کے تصوّر زندگی کی ایک تجسیم تام ہے۔

اسی طرح شام نہ صرف سحر کی عکاسِ لطیف اور وسیلۂ باز یافت ہے بلکہ ان تمام کیفیتوں کی ایک جمالی اور انفعالی صورت بھی ہے جو سحر کے جلال اور استیلا سے ایک نسبتِ اصلی رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبالؔ میں شام و سحر کا نفوذ و وجود دائمی ہے، ہنگامی نہیں۔ وہ بہار کی رنگینیوں، خزاں کی دلآویزیوں، کوہ و صحرا کی کیفیتوں آبشار کے زمزموں، طیور کے چہچہوں، آبِ رواں کی جلوہ سامانیوں اور ہوائے بیاباں کی دل سوزیوں سے دامن چھڑا لیتا ہے۔ لیکن صبح و شام کے حلقۂ جاوداں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کہ اس سے باہر قدم رکھنا خود زندگی سے کنارہ کرنا ہے۔

یہاں یہ نقطہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ سخنِ اقبالؔ میں نمودِ صبح از اوّل تا آخر نمودِ زندگی کی علامت ہے اور شام ایک ایسا وقفۂ جمیل و لطیف ہے جو اس نمو کی بار بار تجدید کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شاعر اس تصور کی اعلیٰ کیفیات تک

آہستہ آہستہ پہنچا ہے۔ لیکن اس نے اس احساس کی بنیادی حقیقت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس کے اظہار و بیان میں مد و جزر ضرور پیدا ہوا ہے لیکن مدعا کی اصلیت اور مقصود کی قطعیت میں کبھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ اس کی کیفیت کی ابتدائی صورت ملاحظہ فرمائیے ؎

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ ور دامن سحر
منزلِ ہستی سے، کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات
مسلم خوابیدہ اٹھ، ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افقِ گرمِ تقاضا تو بھی ہو
وسعتِ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغِ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا، پھر ہو سرگرمِ ستیز
پھر سکھا تاریکیٔ باطل کو آدابِ گریز
تو سراپا نور ہے، خوشتر ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے

ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

آپ نے ملاحظہ فرمایا، شاعر نے سحر کے حسن و جمال سے کس قدر جلد گریز اختیار کیا ہے۔ اور اپنی ساری توجہ اس کی صرف اس کیفیت پر مرکوز کی ہے جس کا تعلق فروغِ حیات اور تجدیدِ زندگی سے ہے۔ لیکن ہر جگہ گریز کی یہ کیفیت نہیں ہے، بلکہ اس میں آہستگی، تدریج اور نرم روی بھی پائی جاتی ہے۔

مثالاً اس بے مثال مرثیے کا ایک مقام ملاحظہ فرمائیے۔ جس کا عنوان ہے "والدہ مرحومہ کی یاد میں"۔ مرثیے کی دل دوز اور الم ناک فضا میں بظاہر صبح کے تصرفات کے امکانات بہت کم نظر آتے ہیں۔ لیکن ذرا دیکھیے ؎

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

آخری شعر میں جس خوبی اور دلآویزی سے شاعر اپنے مرکزِ خیال کی طرف پلٹتا ہے۔ وہ اس کے کمالِ فن اور جذبہ کامل دونوں کی آئینہ دار ہے۔ اس عالم ہست و بود کی مختلف منازل میں سے موت کا مقام ہی ایک ایسا مقام ہے، جہاں پہنچ کر انسان بالکل بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ اور موت کا پنجہ انہیں اس کے ارادوں اور عزائم، اس کی تمناؤں اور آرزوؤں اور اس کے حوصلہ و وقار کو اپنی گرفت میں لے کر چکنا چور کر دیتا ہے۔

لیکن دیکھئے اس مقام پر پہنچ کر بھی شاعرِ مشرق اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا۔ اور اپنی ماں کے مرقد پر سرنگوں نہیں ہوتا۔ بلکہ افقِ خاور کی طرف دیکھتا ہے اور زندگی کی ایک نئی صبح کو خوش آمدید کہتا اور خود زندگی کو نمود و درخشانی کا پیغامِ حیات افروز دیتا ہے۔

اکتساب و انتشارِ نور اور تحریک و توسیع زندگی کی اس سے خوب تر مثال دنیا کے شعری ادب میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ اور اب ایک اور منزلِ جمیل دیکھئے ؎

طلوعِ اسلام

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
سرِ شکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
نوا پیدا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

شعرِ اقبالؔ کے صحنِ چمن میں صبح جس انداز سے جلوہ گر ہوئی ہے وہ ہماری زبان تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔

یہ سچ ہے کہ وہ پتی پتی پر نقش و نگار نہیں کرتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ انتظار محبوب میں نسیم سحر کے ساتھ مل کر آہیں نہیں بھرتا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ وہ نالہ بلبل میں اپنے درد کا درماں تلاش نہیں کرتا۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ خود ایک جہان صبح گاہی اس کی چشم تماشا میں آباد ہے۔ اور کیا یہ بھی سچ نہیں کہ اس کا سینۂ سوزاں خود ایک چمنستان بے خزاں ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک حقیقت نہیں ہے کہ اس کی آہ سحرگاہی ہزار نالۂ نیم شب کی سرمایہ دار اور ایک جہان تازہ کی خلاق ہے۔

فرمایا کہ ؎

نوائے صبح گاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

پھر ارشاد ہوا کہ ؎

کیا عجب میری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تیری خاک میں ہے

پھر فرمایا کہ ؎

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ میری آہ صبح گاہ میں ہے

پھر ارشاد ہوا کہ ؎

دمِ عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے

اگر نہ تی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

پھر فرشتوں کی زبان سے آدم کو کہلوایا کہ ؎

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

پھر وادیٔ لولاب سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد کیا کہ ؎

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب !

اور پھر اس کے محاسن کی تشریح یوں فرمائی کہ ؎

اے پیرِ حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

اقبالؔ نے اپنے بعض مثالی تصوّرات کو مجسم بھی کیا ہے۔ مثلاً شاہین کہ سخت کوشی ، بلند پروازی ، گرمئ عمل اور رفعت پسندی کا مجسم تصور ہے۔

اسی طرح گل لالہ کو حرارت زندگی کا مظہر اور خونِ حیات کا عکّاس ہے۔ اسی طرح صبح کو انہوں نے شعاعِ آفتاب اور اذان میں متشکّل مجسم کیا ہے۔ اور ان دو مجسّمات لطیفہ سے انہیں ایک نہایت گہری وابستگی ہے۔

اذان کو وہ کائنات کی بیداری کا پیام لرزاں قرار دیتے ہیں اور اسی سے وہ تسکین لازوال حاصل کرتے ہیں۔ جو صبح امید کی نمود سے خاص ہے۔ فرمایا کہ ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اور اس کی قوت وصولت کی تشریح یوں فرمائی کہ ؎

اِک رات ستاروں سے کہا نجمِ سحر نے
آدم کو کبھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار
کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا
اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار
بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذّتِ بیداری شب سے
اونچی ہے ثریّا سے بھی یہ خاکِ پُراسرار
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیّار
ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے سرِ کہسار

اسی طرح شعاعِ آفتاب میں سحر کی جلوہ سامانیوں اور پیامِ زندگی کی حرکت و حرارت کو مرکوز کیا اور اسے ان تمام کیفیات کی آئینہ داری عطا فرمائی، جو نمودِ زندگی سے مختص ہیں ؎

صبح جب میری نگاہ سودائی نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اک کرن سے اے سراپا اضطراب
تیری جانِ ناشکیبا کو ہے کیسا اضطراب
تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں

یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے کیا ہے یہ
رقص ہے، آوارگی ہے، جستجو ہے، کیا ہے یہ

اور اب شعاع کا جواب سنیئے ؎

خفتہ ہیں ہنگامے میری ہستی خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذت تنویر رکھتی ہے مجھے
برق آتش خو نہیں، فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہر عالم تاب کا پیغام بیداری ہوں میں
سرمہ بن کر چشم انساں میں سما جاؤں گی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا ہے دکھلاؤں گی میں
تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے
سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے

انوارِ سحر کلامِ اقبال کے صفحات پر اس کثرت سے جلوہ پاش ہیں۔ کہ نگاہ کو فرصتِ نظارہ میسر نہیں ہے۔

گزشتہ شب جب میں نے موجودہ مطالعے کے لئے کچھ مثالیں تلاش کرنا چاہیں تو دیوان کے ہر ورق نے میرا دامن اس سے انداز سے کھینچا کہ نگاہِ انتخاب بے بس ہو کر رہ گئی۔ اور ایک عالمِ مایوسی میں میں نے اپنی جستجو ترک کر دی۔ جو مثالیں میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں محض ارتجالاً

پیش کی ہیں۔ ان میں انتخاب کو بہت کم دخل ہے۔

وقت کی تنگی کے پیش نظر اب میں صرف ایک آدھ مثال آپ کے سامنے رکھ کر آپ سے رخصت چاہوں گا۔ مگر شاید میں یہ بات بھول گیا ہوں کہ ابھی شام کی بات ساری کی ساری باقی ہے۔

محض شاعرانہ حسن و خوبی کے اعتبار سے بھی اقبال کے وہ اشعار تابدارجو نمود صبح اور آمدِ شام سے متعلق ہیں۔ ایک بے مثال حیثیت رکھتے ہیں۔

فرصت ہوتی تو ان کی بہت سی مثالیں آپ کے سامنے لاتا۔ لیکن وقت کے ہاتھوں مجبور رہوں۔ تاہم صبح کا ایک منظرِ جمیل کہ فلسطین کی فضا سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کی توجہ کے لئے دامن بار بار کھینچ رہا ہے سہ

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہ ضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے
ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیش و دوام ہے یہی

اور اب فلسطین تک آئے ہیں تو لگے ہاتھوں قرطبہ بھی ہوتے چلیں اور اگرچہ ہم نے یہاں شاعرِ مشرق کو ہنگامِ غروب میں پایا ہے تاہم اس کا نغمۂ شام اس درجہ دامن کشِ دل ہے کہ اب اسے کسی تمہید کے بغیر ہی پیش کرنا پڑے گا ۔

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ پُرسوز ہے دُخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

صورتِ شمشیر ہے، دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اور ظاہر ہے کہ شفقِ شام کے لعلہائے گراں مایہ نے اپنی سرخی اسی خونِ جگر سے مستعار کی ہے جس کے بغیر نقش ناتمام ہیں اور ہر روز عمل اپنی شام ہی کے آئینے میں اپنی فردِ حساب کا ناظر ہے اور پھر اسی سلسلۂ روز و شب سے اقوام و ملل کے مقدرات اپنے نشیب و فراز مرتب کرتے اور ابد کے کناروں کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور آبِ رواں کبیر کے احساس سے ذہن معاً ایک اور آبِ رواں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جو ہم سے بغایت درجہ قریب ہے۔ میری مراد راوی سے ہے۔ جو اقبال کی ایک یادگار شام یوں محوِ سرور ہے:۔

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو
سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شراب سرخ سے آبگیں ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہ شہسوارِ چغتائی
فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے سرود خموش ہے گویا
شجر یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا
رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرمِ ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور ہوگئی
جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یوں ہی
ابد کے بحر میں پیدا نہیں نہاں ہے یوں ہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا
اس منظر سحر آگیں کی حیرت ناک تصویر کشی کے کمال سے قطعِ نظر یہ

نقطہ قابل غور ہے کہ اقبالؔ کے ہاں شام کے اثرات میں ممتاز ترین احساس سوز و گداز کا وہ احساس ہے جو حرکت و عمل کے عین برعکس واقع ہے اور اسی کا رد عمل پیش کرتا ہے۔ وہ سیلِ تندرو جو صبح دم منبع مشرق سے رواں ہوتا ہے۔ شام ہوتے ہوتے ایک جوئے نغمہ بن جاتا ہے۔ اقبالؔ اس اعتبار سے فطرت کا پورا ہم نوا ہے اور اس کے تمام نغمہ ہائے شام، سوز و گداز نرمی و آہستگی کے ایک بے نام احساس سے سرتاسر معمور ہوتے ہیں۔

پیغامِ اقبالؔ

اساتذہ سلف نے جس شاعری کو پیغمبری قرار دیا تھا۔ ہماری صدی اور ہمارے ملک میں اگر اس کا اطلاق کسی شاعری پر ہوتا ہے تو وہ لاریب حکیم الامّت علامہ اقبالؔ کی شاعری ہے۔ اور اقبالؔ کی شاعری کا پیغامی عنصر ہی درحقیقت اس کی روح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر کو پیغمبر کے مقام پر پہنچتے پہنچتے بہت سی روح فرسا منازل اور بہت سے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ لیکن جب وہ اس مقامِ موعود پر پہنچ گیا جو اس کے لئے مقدّر کیا گیا تھا تو پھر وہ تمام مناظرِ حقیقت اس کی چشمِ بینا کے سامنے یک بہ یک اُبھر آئے جو اُس کے ہم چشموں سے مستور اور ان کی ظاہر بیں نگاہوں سے دور تھے۔ جبھی فرماتے ہیں ؎

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے

اور یہ عشق اور یہ حاصلِ سوز و ساز کیا تھا، اس حقیقت کے چہرے سے بھی خود ہی نقاب اٹھاتے ہوئے فرمایا کہ ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

غور کیجئے تو ان کا سارا فلسفۂ زندگی اور ان کی تمام کائناتِ پیغمبری انہی دو مختصر الفاظ میں سما گئی ہے۔ جنہیں ان کی شاعرانہ بلاغت اور قلندرانہ زبان دردِ عشق کے نام سے پکارتی ہے۔ اس جنس گراں مایہ سے خطاب کرتے ہوئے وہ اس کے جوہرِ لطیف کو یوں عیاں کرتے ہیں ؎

اے دردِ عشق ہے گہرِ آب دار تو
نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو
آئی نئی ہوا چمنِ ہست و بود میں
اے دردِ عشق اب نہیں لذّت نمود میں
ہاں خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو
منّت پذیر نالۂ بلبل کا تو نہ ہو
پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا
اشکِ جگر گداز ہی غمّاز ہو ترا

یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز
مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز

اور از بسکہ اقبالؔ کے ہاں مقامِ عشق، مقامِ عقل سے منزلوں آگے ہے اس لئے دردِ عشق کو علم و حکمت کے بس کا روگ نہیں سمجھتے ان کے نزدیک عشق و یقین کی اقدار حکمت و ادراک کی اقدار سے بدرجہا زیادہ گراں اور عسیر الحصول ہیں۔

پس اس مقام تک جسے فوزِ عظیم کہا گیا ہے۔ خواہ وہ افراد کی زندگی میں ہو یا اقوام کی۔ جادۂ عشق و یقین ہی رہنمائی کرتا ہے۔ طریقِ عقل و دانش یہاں تک نہیں پہنچتا۔ یہی سبب ہے کہ اس بیسویں صدی میں جب کہ علم الاشیاء اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکا ہے اور حکمتِ انسانی نے ہفت صد کشورِ زمینی و آسمانی تسخیر کر لئے ہیں۔ اقوام و افراد دونوں کسی منزل گہِ تسکین و اطمینان کو پہنچنے کی بجائے ایک اضطرابِ دائم، ایک کش مکشِ پیہم میں گرفتار ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کس لئے جا رہے ہیں۔

اقبالؔ نے اس عالم میں انسانیت کو جو پیغام دیا ہے وہ بنیادی طور پر روحانی ہے اور نفع گیری اور دولت اندوزی کے ظاہری و مادی معیارِ زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

اس سے میری یہ مراد نہیں کہ اقبالؔ ترکِ دنیا یا رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس سے میرا مدعا محض یہ ہے کہ اقبالؔ

کا انسان کامل دنیا میں رہ کر دنیا کی مٹی میں نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اس سے اونچا اٹھتا ہے اور درآں حالیکہ اس کے قدم زمین اور اس کی طلائی خاک کو چھو رہے ہوتے ہیں۔ اس کے شانے ہم دوشِ ثریا ہو جاتے ہیں ؎

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

پھر ہمتِ عالی کی پر کشادگی اور زندگی کی حرکت پسندی پر اسی پیام میں ایک بنیادی حقیقت کے رخ سے یوں پردہ اٹھایا ہے ؎

آتی تھی کوہ سے صدا، رازِ حیات ہے سکوں
کہتی تھی مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

اور دیکھئے کہ عشق کی دردمندی نے اپنے سوزِ دروں کی قوت سے منصوبۂ کائنات میں حرکت کو کس طرح اس کا مناسب مقام دلایا ہے۔

پھر ارشاد ہوا کہ ؎

موت ہے عیشِ جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

زندگی اور موت میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے اور جس سے وجود اور عدم کا فرق بہ یک نظر نمایاں ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ حرکت ہے اور اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس عالم ہست و بود کی رونق جس شے سے قائم ہے اور کائنات کا سانس جس اعجاز سے چل رہا ہے اور منصوبۂ خداوندی میں جو روح کارفرما ہے وہ حرکت اور محض حرکت ہے اور عمل اور نمود اور انجام اور فروغ اور کامرانی اور وہ تمام کیفیتیں جو باہم مل کر زندگی کی تخلیق و تشکیل کرتی ہیں، حرکت ہی سے جنم لیتی اور اسی کو زندگی کی گوناگوں صورتوں میں منتقل کرتی چلی جاتی ہیں۔

پھر یہ امر ہمارے لئے کیوں نہ باعث فخر و اطمینان ہو کہ مشرق کے بیشتر شاعروں کے خلاف، ہمارے قومی شاعر نے اپنے نغموں میں جو جادو جگایا ہے اور اپنے شعر کو جس روح سے حیات جاوداں عطا فرمائی، وہ جادو اور وہ روح حرکت ہی سے مستعار ہے اور حرکت و عمل ہی کا وہ تڑپتا ہوا پیغام جو سخنِ اقبالؔ کے جسم میں خون گرم کی طرح جاری و ساری ہے اس کی سب سے توانا و تابناک کیفیت کا درجہ رکھتا ہے۔

اسی نظم میں جو بجائے خود ان کے پیغام کا ایک خلاصۂ معطر ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

اور اس جذب و فروغ کی تشریح ایک جگہ اور یوں فرمائی ہے کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نُطقِ اعرابی

اتحادِ اسلامی کی اس سے جمیل تر تشبیہہ کا تصور قریب قریب محال ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شاعرِ اتحادِ ملت کا جو پیغام امتِ مسلمہ کو دیتا ہے اس کا پیکر مادی یا ملکی نہیں، بلکہ خالص فکری اور جذباتی ہے اور یہی طرزِ فکر اور یہی اندازِ احساس اس کی روحِ سخن میں جاری اور اس کے سرودِ پیمبری میں جاری و ساری ہے ؎

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو، دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہو تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

پھر آج کی دنیا ئے مادہ پرست کی فضا میں اقبال کی زبان سے یہ کہنا کیا غلط ہے کہ ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

فکرِ اقبالؔ میں وطن و ملّت کی کشمکش

واضح رہے کہ میں نے اس مقالے کی تعمیر میں محض نظمِ اقبالؔ، بلکہ زیادہ تر اقبالؔ کی اُردو شاعری ہی سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ اُس کے علمی و سیاسی خطبات سے واسطہ نہیں رکھا۔

آج سے کم و بیش پچاس برس پیشتر جب اقبالؔ نے شعر کہنا شروع کیا تو شاعر کے ہنگامۂ دل کے سوا باقی سب ہنگامے خاموش تھے۔۔۔ ہندوستان میں سرسید کی تحریک بار ور ہو چکی تھی اور مسلمانانِ ہند حصولِ تعلیم کے ذریعہ سے فلاحِ دنیوی کا راستہ تلاش کر چکے تھے۔ اِدھر کانگرس تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ مقامی حکومت میں ملکی عناصر کی شمولیت پہ آہستہ آہستہ اصرار کر رہی تھی۔ بیرونِ ہند کے اُن ممالک پر جنہیں دنیائے اسلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک کامل سکوت و جمود مسلط تھا۔ ہمارا

ہمسایہ ملک افغانستان، انگریز کی شاطرانہ سیاست سے مات کھا کر قریب قریب ایک ہندوستانی ریاست کی سطح تک گر چکا تھا اور اسی حال میں خوش تھا۔ ایران پر ایک طرف سے انگلستان اور دوسری جانب سے روس کا اقتدار آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اور ایرانی قوم اپنے قاچاری فرماں رواؤں کے طلسمِ اقتدار اور ان کے مغربی حلیفوں کے سحر سامری سے مدہوش ہو کر ایک خوابِ طویل میں گم ہو چکی۔ ترکی اور اس کے مقبوضات مثلاً شام، فلسطین، عرب، عراق اور طرابلس پر ایک جابر اور مستبد سلطان ایسی حکمت سے حکومت کر رہا تھا کہ ہنگامی طور پر اغیار و ابرار دونوں دم بخود تھے۔ مصر پر خدیو کے پردے میں خود انگریز حکمراں تھا اور اہل مصر کو انگریزی تعلیم کے ذریعے سے مغربی تہذیب و تمدن کے سانچے میں نہایت سرعت سے ڈھالا جا رہا تھا۔ انڈونیشیا کا کسی نے نام تک نہیں سنا تھا۔ اور وہاں کے مسلمان ولندیزی حکومت کے خواب آور سائے میں تعددِ ازدواج اور تواترِ حج سے اپنے اسلام کا ثبوت دے دے کر، شکر اور مسالے کی تجارت میں اپنی قومی زندگی کو مدغم کر چکے تھے۔ غرضکہ بحرالکاہل کے مجمع الجزائر سے لے کر مغربِ اقصٰی تک سارے عالم اسلام پر ایک خوابِ گراں طاری تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نیند کا ماتا صورِ اسرافیل کے پھونکے جانے تک یوں ہی سوتا رہے گا۔

اس میں کلام نہیں کہ انیسویں صدی کے آخر میں ایک مردِ غیب نے جو بیک وقت مفکر بھی تھا اور مجاہد بھی ——— میری مراد

جمال الدین افغانی سے ہے ۔ اپنی پوری قوت سے اس سکوتِ مرگ نما کو توڑنے کی کوشش کی ۔ لیکن فرنگ کی عیاری نے خود انہی ہاتھوں سے اُس کی نحیف آواز کو ہمیشہ کے لئے خاموش کروا دیا ۔ جن ہاتھوں کو وہ از سرِ نو قوتِ حیدری سے آشنا کر دینا چاہتا تھا ۔ جمال الدین افغانی کا موقف سراسر سیاسی تھا ۔ اور وہ ایک ایسے وقت میں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کو روکنے کا آرزو مند تھا ۔ جب اس کار کنا محال ہو چکا تھا ۔ نتیجہ وہی ہوا جو مقدر تھا ۔ یعنی اسے اپنے مشن میں ناکامی ہوئی ۔ اور ہماری شامِ زوال کا یہ پہلا ستارہ اپنے محلِ غروب میں ایک غبارِ نور ضرور اپنی یادگار چھوڑ گیا لیکن اقوامِ اسلام کو ایک لڑی میں منسلک دیکھنے کی آرزو اس کے سینے میں جھلملاتی ہی رہی ۔ نہ اس کی زندگی میں بر آئی ، نہ اس کی موت کے بعد اور کون جانتا ہے کہ اتحادِ اسلامی کا خواب جو افغانی نے اس صدی کے شروع ہونے سے پہلے دیکھا تھا ۔ کب تک محرومِ تعبیر رہے گا ۔

جمال الدین افغانی محمد تغلق کی طرح اپنے زمانے سے بہت پہلے پیدا ہوا تھا ۔ اور اس نے تغلق ہی کی طرح بیک جست وہ فاصلے طے کرنے چاہے تھے جو ایک بہت بڑی تیاری کے طالب تھے ۔ اس کی نگاہ نتائج پر تھی ۔ وسائل پر نہیں تھی ۔ اور اُس نے اس عظیم الشان تربیت کو نظر انداز کر دیا تھا ، جو ہر ملّت کے لئے کسی اقدامِ عظیم سے پہلے ناگزیر ہوا کرتی ہے ۔

یہ سعادت جیسا کہ میں آگے چل کر دکھاؤں گا ۔ اقبالؔ کے حصے میں آئی ۔

اور خوبیٔ قسمت سے اس نے اپنا پیغام، ملت کے ایک ابھرتے ہوئے طبقے کو ایسے وقت میں دیا جب وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا اہل ثابت ہوگا یا نہیں، لیکن قدرت نے پیام بر کا منشاء اس کی آرزو کے عین مطابق پورا کیا اور اُسے اُس فوزِ عظیم سے سرفراز کیا جو خاصانِ ازلی ہی سے مخصوص ہے۔

اقبالؔ کی شاعری کا آغاز، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، ایک عالمِ سکون میں ہوا تھا۔ اس لئے لازم تھا کہ اس کے ابتدائی دور میں وہی عناصر فروغ پائیں جو شاعر کی فطرت کے ساتھ خلق کئے گئے تھے۔ یہاں ہمیں شاعر کی ان تخلیقات سے بحث نہیں۔ جو خالصتاً اس کی داخلی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں یا جن کے مظاہر نے عالمِ رنگ و بو میں سے مختلف انفرادی صورتیں اختیار کر لیں۔ بلکہ ہمیں صرف اس کی ان تخلیقات سے غرض ہے۔ جنہیں اُس کے بنیادی جذبات نے اجتماعی محبت کا جامہ پہنایا۔ اس اندازِ نظر سے جب ہم اقبالؔ کی ابتدائی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو قدرت اور عورت کے حسن کی پرستش کے بعد جو جذبہ ہمیں سب سے نمایاں نظر آتا ہے وہ وطن کی پرستش ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شاعر کی جبلّت میں اس جذبے کی تخلیق اور فروغ دونوں ایک فطری اور وہی حیثیت رکھتے ہیں۔ عین اسی طرح جس طرح حسن کی کشش اور جمال کا جذب اس کی جبلّت کا فطری حصہ ہے۔ وطن کی محبّت کا فروغ و ارتقاء اس کی شاعری میں انہی خطوط کے متوازی ہوا۔ جن خطوط پر اس کے اظہار کی قوت اور اس کے

محسوسات کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ اور حب وطن کا اندازہ بھی اسی نسبت سے وسعت و جمال حاصل کرتا گیا جس نسبت سے اس کے احساس کا افق پھیلتا اور رنگین تر ہوتا چلا گیا۔

ہمالہ سے خطاب حب وطن کے اظہار میں اس کی پہلی نظم ہے اور اپنے اندر شگفتگی و لطافت اور جبروت و قوت کے وہ بیشتر عناصر رکھتی ہے جو عظیم شاعری سے محفوظ ہیں۔ اس کیفیت کے علاوہ وہ شاعر کے قلب کا ایک گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی پیش کرتی ہے، شاعر کے وطن پر اغیار کا قبضہ ہو چکا ہے. وہ خود روز و شب غلامی کی گھٹی ہوئی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اس کے ملک کی تاریخی عظمت ایک دفترِ پارینہ بن چکی ہے قدم قدم پر اُسے ایسے موانع و حوادث پیش آرہے ہیں، جو اسے برابر اپنی غلامی اور اپنے ابنائے وطن کی پستی کی یاد دلاتے جاتے ہیں۔ ایسے میں اس کا تخیل اپنے لئے ایک فرار کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔ ایک ایسا فرار جو بیک وقت جمیل بھی ہو اور بلند بھی جو اس کی جستجوئے جمال اور آرزوئے عظمت دونوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچا سکے اور آخر اس نے وہ فرارِ عظیم و جمیل تلاش کر لیا۔ یہ تھا ہمالیہ! عظمت مآب اور لطافت آثار ہمالیہ!

اے ہمالہ! اے فصیل کشورِ ہندوستان
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشان
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیان

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ راہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

شاعر کی آرزو کہ گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑ پڑے اور وہ صبح وشام اس کے پیش نظر کر دے. جب اس کے آباء انسانیت کے اس مسکن اوّل کی وادیوں میں آکر آباد ہوئے اور ایک سیدھی سادی زندگی بسر کرنے لگے۔ عہد حاضر کی انسانیت کش تہذیب کے خلاف ایک پر زور رد عمل کی حیثیت رکھتی ہے. اور فرار کی اس شدید کیفیت سے بھرپور ہے جس سے خود شاعر سر تا سر متأثر نظر آتا ہے۔

اقبالؔ کو ہندوستان کی غلامی کا نہایت شدید احساس تھا. اور یہ احساس اس کی ان نظموں میں خاص طور پر نمایاں ہے. جو اس نے اپنی شاعری کے پہلے دور میں یعنی انگلستان جانے سے پہلے لکھیں. ان میں تصویرِ درد ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور ان کیفیتوں کو سامنے لاتی ہے جو اس محکوم ملک کی دو بڑی قوموں کے باہمی اختلاف اور نتیجتاً ایک بیرونی قوم کے تسلّط میں کارفرما تھیں. تصویرِ درد کبھی شاعر کے جذباتی پہلو سے ایک نمایاں تعلق رکھتی ہے. اور اس کے تخلیقی عناصر نے شاعر کے ضمیر میں اسی طرح پرورش پائی ہے. جس طرح اس کی ابتدائی شاعری کے دیگر جذباتی عناصر نے اور اس لئے مرورِ ایام کے باوجود اور ان کیفیتوں کے نابود ہوجانے کے باوصف، جو اس نظم کی تخلیق کا باعث بنیں، اُس کی اپیل آج بھی کارگر اور اس کا جذب آج بھی تازہ ہے ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس نظم میں شاعر کے بیان کی ممتاز ترین کیفیت اس عالمگیر جذبہ محبت کا اظہار ہے، جس نے پہلے وطن اور بعد میں ملت کے عشق کی صورت اختیار کی۔ اور ازبسکہ عشق ہی وہ قدرِ مطلق ہے۔ جسے شاعر کے نظام فکر و احساس میں اولیں عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے ارتقائے پیام و فن کی ہر منزل میں اظہار جذبۂ عشق نے ایک یادگار اور غیر فانی کیفیت اختیار کر لی ہے۔ اس رجحان کی انتہا یہ ہے کہ جب شاعر وطن کی محدود فضا سے کائنات کی غیر محدود فضا کی طرف بڑھتا ہے۔ اور اس کے ضمیر میں ملت کے

جمیل تر تصوّر کی تشکیل ہوتی ہے، اس وقت وہ عشق ہی کے بازوئے ہمت کا سہارا لیتا ہے۔ اور اس کے برعکس جب وہ اپنے اولین محسوسات و تجربات میں ملّت کی غیر مرئی فتوحات سے منہ موڑ کر وطن کی حرارت اندوز کیفیات کی طرف لپکتا ہے، تب بھی وہ محبت ہی کا اعتماد آفریں سہارا ڈھونڈتا ہے ؎

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی چمن بھی ہے (۷)
محبّت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی راہزن بھی ہے
اجاڑا ہے تمیزِ ملّت و آئین نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے
سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

اقبالؔ کی شاعری پر وطن کی محبت کا یہ رنگ ابھی جم ہی رہا تھا کہ اسے تعلیم کے سلسلے میں یورپ کا سفر درپیش آیا۔ یورپ میں اقبالؔ کے قیام کا زمانہ زیادہ تر کیمبرج، لندن اور ویمبرا اور ہائیڈل برگ (جرمنی) میں بسر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ایک طرف جرمنی میں بسمارک کی روح عسکریت کا جسم اختیار کر رہی تھی۔ اور دوسری جانب انگلستان بظاہر ایک امن پسند بادشاہ کے سائے تلے چند لمحوں کے لئے

ستا رہا تھا بلکہ تازہ دم ہوکر از سرِ نو اُس ہنگامہ دار و گیر میں کود پڑے جہاں یورپ کی وطن پرست قومیں اپنے اپنے مقبوضات کی حفاظت اور مزید مفاد کے حصول کی غرض سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار ہو رہی تھیں۔ اور جس نے آخر چند ہی سال میں اوّلین جنگ عظیم کی مہیب صورت اختیار کرلی۔ یورپ کی اس جارحانہ وطنیت نے شاعر کے محسوسات و خیالات پر ایک عجیب اثر کیا۔ اور اگرچہ ایک عرصے تک اپنے وطن سے اس کے گہرے جذباتی تعلق نے فکرِ تازہ کے اس سیل رواں کو روکے رکھا جو اس کے دل و دماغ پر چھا جانے کے لئے بڑی شدت و قوت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن کہاں تک! وہ آخر کار اس ردِ عمل سے مغلوب ہوگیا، جسے مغرب کی وطن پرستی کے جارحانہ مظاہر نے اس کے خانۂ احساس میں جنم دیا تھا۔ اور پھر اس انقلاب کی زہرناکی ان محبوب علاقوں میں بھی سرایت کر گئی جہاں کبھی شاعر نے نگارِ وطن کو سجود و سلام کا خراج پیش کیا تھا۔ اور عقیدت و محبت کے گیت گاتے تھے۔ اور اگرچہ پھر شاعر کا تخیل مغرب کی طوفان زدہ فضاؤں میں کوئی نیا شوالہ تو نہ بنا سکا۔ لیکن ان مانوس راہوں سے الگ ہوتے ہوئے جن پر اس کا جوہر خلاق برسوں خراماں رہا تھا۔ اس نے اپنی دور افتادہ جنم بھومی کے دھندلکوں کی طرف ایک نگاہِ واپسیں ضرور ڈالی اور ایک لمحۂ والہانہ میں بے اختیار پکار اٹھا کہ ؎

یوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
میں نے اے اقبالؔ! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی ۱؎

اور پھر وطن سے اس کے جذباتی اور روحانی تعلق پر رفتہ رفتہ اس کا وہ فکری ردعمل غالب آتا چلا گیا جسے اس کے قیام یورپ کے اثرات نے ابھارا تھا اور جو ایک عرصے تک بے منزل و مقصود رہ کر آخر ایک نئے راستے پر چل نکلا کہ اور کون نہیں جانتا کہ یہی وہ راستہ تھا جو انجام کار تصور ملت کی پہنائیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ شعر اقبالؔ کی یہ عبوری اور ہنگامی کیفیت اس کی اس معرکہ آرا غزل سے ہویدا ہے جو اس نے قیامِ فرنگ کے ایام آخری میں لکھی ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز پھر آشکار ہو گا
نہ پوچھ اقبالؔ کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ راہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہو گا

میری ناچیز رائے میں اقبالؔ کی یہ غزل اس کی شاعری میں اس موڑ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے مڑتے ہی وطنیت کا مرغزار اس کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔ اور ملت کا صحرائے عریض و بسیط سامنے آ گیا۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سدا بہار وادی کی یاد عمر بھر

اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی اور اس کے فکر میں وہ مدوجزر بپا رہا، جس کا مطالعہ آج ہمیں مطلوب ہے۔

۳۔ شاعرِ مشرق کے زمانۂ قیامِ یورپ کا کلام دو واضح اعتبارات سے ممتاز ہے۔ ایک وطن سے ملّت کی طرف آغازِ انحراف کے اعتبار سے اور دوسرے اس یاس انگیز کیفیت کے اعتبار سے جو شاعر کی مشرقی روحانیت اور مغربی تہذیب کی مادّیت کے تصادم سے اس کے کلام میں رونما ہوئی۔ اگرچہ یہ دونوں کیفیات اس کے کلام کے اس دور میں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں لیکن پہلی کیفیت یعنی وطن سے گریز اور ملت سے اتصال کی کیفیت دوسری سے بدرجہ غایت نمایاں ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ تہذیب کی بے حاصلی نے اس کے فکر پر ایک نہایت گہرا سایہ ڈالا اور اس کے کلام میں مقصودِ انسانیت کی جستجو پیدا کی۔ لیکن وہ اس مقصود کی تلاش کرتے کرتے پھر ملت ہی کے ویرانے میں آنکلا اور وہ اقبال جس نے کبھی ہندوستان کی ماہ سیماؤں کے گیت گائے تھے۔ اور فرنگ کی مادّیت نواز حکمت کی طرف سے مایوس ہو کر یہ کہا تھا کہ ؎

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی
حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

اور پھر اسی عالمِ حزن و یاس میں قنوطیت کی اس لے پر اپنے ساز سخن کو چھیڑا تھا کہ ؎

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کے جلانے کے لئے
وائے ناکامی فلک نے تاک کو توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لئے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو
آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے
اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

وہی اقبالؔ وطنیت اور قومیت کے مغربی تصوّرات سے یکایک اس درجہ خائف اور متنفر ہوا کہ اس کی شاعری کا دھارا دیکھتے ہی دیکھتے وطن اور قوم کی تنگنائے سے نکل کر ملّت کی وسعتوں میں رواں اور آفاق کی پہنائیوں میں گم ہو گیا// اور یہاں پر ہماری بحث میں یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا شاعر کا وطن سے ملّت کی طرف انحراف ایک سیدھے سادے گریز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا اس میں ایک ایسی ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جو وطن سے آفاق کی طرف بڑھنا اور پھر آفاق سے خلاصۂ آفاق یعنی ملّت میں رونما ہوتا ہے۔ لیکن فی الحال ہم اس نکتے پر بحث نہیں کریں گے۔ بلکہ کوشش کریں گے کہ آگے چل کر یہ راز خود بخود

عیاں ہو جاتے۔

اس امر میں شک کی بہت کم گنجائش ہے کہ مغرب کی کھوکھلی نیشلزم اور تعصب آموز وطن پرستی نے شاعر کے ذہن پر یہ بات نقش کر دی تھی کہ انسانیت کی نجات نہ وطنیّت میں ہے، نہ قومیت میں اور نہ مذہبیت میں، بلکہ اس آسمانی تسلط میں ہے جو زمین پر نافذ ہو کر بھی اپنی الوہیت برقرار رکھتا اور انسان کو اس حقیقی کامرانی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ جس کا قسّام ازل نے اسے حقدار ٹھہرایا ہے۔ اقبالؔ کو مغرب میں رہ کر اس بات کا بھی شدید احساس ہوا کہ مغرب روح مذہب سے بالکل بے گانہ رہے گا اور مذہب کو اس کی اجتماعی زندگی میں کبھی وہ دخل نہیں ہو سکے گا جو زندگی کی اہم اور اعلیٰ اقدار پر اثر انداز ہونے کی قوت رکھے۔

اقبالؔ نے یہ بھی محسوس کیا کہ مذہب کا وہ روپ جو یورپ پر چھا رہا ہے، اپنی جگہ خود بے بس اور بے روح ہے اور اس سے قطعاً یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ فرنگ کی مادی تہذیب اور اس کی کارفرمائیوں پر اعتدال اور روحانیت کا سایہ ڈال سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ احساس بھی روشن تر ہوتا چلا گیا کہ مقابلے اور مجادلے کی اس دنیا میں انسان بیسیوں ٹکڑوں میں محض اس لئے تقسیم ہوتا اور اس تقسیم کو پختہ اور نمایاں کرتا چلا گیا ہے۔ کہ نوعِ بشر کا ہر گروہ دوسرے گروہ کے مقابلے میں اپنے آپ کو زندہ اور زندہ تر رکھنے کا آرزومند ہے۔ اور پھر ان تمام احساسات نے مل کر اس کی فکر اور اس کے وجدان کی اس

حقیقت عظمیٰ کی طرف رہنمائی کی یہ پیکار مسلسل جسے وطنیت کا جذبہ جنم دیتا اور قومیت کا جنون پروان چڑھاتا ہے۔ اگر یوں ہی جاری رہی تو انسانیت تباہ و برباد ہوتے نہ معلوم کس انجام کو پہنچے گی اور وہ اشرف المخلوقات جو اصلاً مسجود ملائک تھا۔ ذلت و مسکنت کی کن گہرائیوں میں لڑھکتا ہوا اسفل السافلین میں قرار پائے گا۔ اور یہاں توفیق الٰہی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے ان بلندیوں کی کی طرف لے اڑی جو سینا کی ہم چشم اور فاران کی ہم سایہ تھیں اور ان نعمتوں پر شاعرِ مشرق کو یہ عرفان ارزانی ہوا کہ وہ پیام قدسی اور وہ نوید سرمدی جو حرا کے غار میں ایک پیکر بے مثال کو دی گئی تھی۔ اسی میں اس کی نجات کا ملہ کا راز مضمر ہے۔ اور انسان اسی صورت میں اپنی تکمیل کو پہنچنے کی توقع کر سکتا ہے جب وہ نسل، ملک اور قوم کے فتنہ پرور اور اصنام کو چکنا چور کر دے اور زمین پر آسمان کی بادشاہت کے قیام اور مقاصدِ الٰہی کی تکمیل کا بیڑا اٹھائے اور اس عالم گیر سماج کی بنیاد رکھے۔ جہاں ایک انسان محض اس لئے دوسرے انسان کے در پے آزار نہیں ہو سکتا کہ اس کا رنگ اس کی نسل، اس کا وطن، اس کی قومیت یا اس کا ظاہری مذہب اس کے اپنے رنگ، اپنی نسل، اپنے وطن، اور اپنی قومیت و مذہب سے جدا ہے۔ اور ایک قسم کے خصائص رکھنے والا گروہ دوسری قسم کے خصائص رکھنے والے گروہ کا صرف اس وجہ سے تابع و مغلوب نہیں ہو سکتا کہ اس کے عمرانی

خصائص دوسرے گروہ کی ایسی ہی خصوصیات سے مختلف ہیں۔ شاعر مشرق اس بنیادی احساس سے بلادِ مغرب میں اپنے قیام کے دوران میں اس درجہ متاثر ہوا کہ وطنیت نہ صرف اس کے ضمیر سخن سے نکل گئی۔ بلکہ ردعمل کے طور پر ایسے نشانات چھوڑ گئی جو میری ناچیز رائے میں اقبال کی شاعرانہ اور مفکرانہ عظمت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ وہ شاعر جس نے کبھی ہمالہ جیسی حسین اور پُر عظمت نظم میں ایسے لطیف جذبات کا اظہار کیا تھا کہ ؎

ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اور ہندوستانی بچوں کے قومی گیت کو کچھ اس دُھن میں چھیڑا تھا کہ ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لَے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینہ
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینہ
جنّت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

وہی شاعر حب وطنیت سے بے زار ہوتا ہے تو کچھ اس انداز میں نغمہ پیرائی کرتا ہے کہ ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیراہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

شاعر کے پیغام اور اس کے اندازِ بیان میں یہ انقلاب اگرچہ اس کے سراپا میں روحِ ملت کے نفوذ کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ پیغام کی حرارت اور انداز کی صلابت اسی ردعمل سے مستعار ہے۔ جو اس کی نگاہوں کے سامنے مغرب میں وطن کی بے محابا پرستش اور

قومیت کی اندھا دھند پاسداری سے پیدا ہوا۔ آگے چل کر یہ کیفیت کچھ بدل سی جاتی ہے۔ اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ایک ناقابل بیان کشادگی اور لطافت اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات شاعر اس بلند سطح سے نیچے اتر آتا ہے جسے ملت کے آفاقی مفہوم نے اس کے لئے تعمیر کیا ہے۔ اور اپنے اس ہبوط کا اظہار بے محابا طور پر یوں کر دیتا ہے کہ ؎

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجمی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

لیکن عام طور پر اس کے انداز میں ایک مثبت قطعیت اور ایک باحوصلہ فراخی پائی جاتی ہے۔ اور اس کی دعوت حقیقت شناسی کو نہ طنز آفرینی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نہ دامانِ پیمبر میں منہ چھپانے کی اور یہ بات ہر صاحب نظر پر روشن ہے کہ علمی اور اجتہادی مسائل میں طنز آلودہ یا ڈرا دینے والے جوابات پیش کرنا دلیل کی کمزوری کا نشان ہوتا ہے۔ اقبال نے ایسے ایک آدھ موقعے کے سوا بالعموم یہ انداز اختیار نہیں کیا اور یہ بات اس کے حق میں کہی جا سکتی ہے کہ ایسے ردعمل کا ردعمل عموماً اسے رضا جوئی، حق کوشی اور رفعت کی طرف لے گیا ہے۔

یہاں پہنچ کر ہمیں ایک لمحے کے لئے رکنا اور اس امر کا تعین کرنا ہے کہ

اقبالؔ کی شاعری میں دراصل ملّت کا مفہوم کیا ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں نے شعرِ اقبالؔ کے بحرِ متلاطم میں بارہا غوّاصی کی۔ لیکن وہ درِّ نایاب جسے گوہرِ مراد کہیئے۔ میرے ہاتھ نہ آیا۔ اور میں ہر بار اس میں سے بے نیلِ مرام ہی باہر نکلا۔ اس میں شک نہیں کہ بلیسیوں خوش قسمت اصحاب گوہر بدست بھی برآمد ہوتے ہیں، لیکن ان سے اکتسابِ فیض کا مجھے موقع نہیں ملا۔ اقبالؔ کے ہاں وطن کے صرف دو پہلو ہیں۔ پہلا اس کا جمالی اور جذباتی پہلو اور دوسرا اس کا تخریبی اور سومناتی پہلو۔ وطن یا وطنیت کا کوئی تیسرا پہلو، ہمیں تلاشِ بسیار کے باوجود اس کے ہاں نہیں ملتا۔ لیکن اس کے خلاف ملّت اس کے مخزنِ شعر میں ایک الماسِ بے بہا ہے کہ ہزار پہلو رکھتا ہے۔ اور ہر پہلو کی تابناکی چشمِ حیراں کو خیرگی کے آداب سکھاتی ہے۔ اس بارے میں بے حد غور و فکر کے بعد آخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اقبالؔ کا تصوّرِ ملّت درحقیقت کوئی قطعی یا جامد تصور نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کی فکرِ نامیہ کا عکس ہے۔ جس میں ہم اس کی ہر آن بدلتی اور بڑھتی ہوئی کیفیتوں کو ہو بہو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سوال کہ اس فکر کے ماخذ اور محرکات کیا ہیں اور آیا شاعر کے جوہرِ طبع کی تربیت میں اس کے عمیق مطالعۂ فلسفہ کو زیادہ دخل تھا یا اس کی خارجی زندگی کے بدلتے ہوئے ماحول اور پس منظر کو، ایک جداگانہ بحث کا طالب ہے، لیکن اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر کے سوشل ماحول اور اس کے عہد کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں اور تبدیلیوں نے اس کے فکر کی نشو و نما اور اس کے نظریاتی

تغیر و تبدل میں ایک فیصلہ کن حصہ لیا، اور اس کی کیفیت و بلوغ کو اس مقامِ لاہوتی پر پہنچا دیا۔ جہاں ہم آج اسے دیکھ رہے ہیں۔ اور میری ناچیز رائے میں تو یہ مقام بھی درحقیقت ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر شاعر کو مبدء فیاض سے زندگی کے پندرہ برس اور ارزانی ہوتے اور وہ خود اپنے وطن کے موجودہ انقلاب میں سے گزرتا تو عین ممکن ہے کہ اس باب میں اس کا بلوغِ فکر فکر ایک واضح اور قطعی کیفیت اختیار کر لیتا اور بالآخر آسودۂ منزل ہو جاتا۔

اقبال یورپ سے ۱۹۰۸ء میں واپس آئے اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء تک کا زمانہ اس سکونِ کامل کا زمانہ ہے جو طوفان سے پہلے فضا پہ عموماً چھا جایا کرتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان اور ۱۹۱۴ء میں محاربۂ عظیم شروع ہوا اور ۱۹۱۸ء تک جاری رہا۔ ۱۹۱۹ء سے ہندوستان کی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی جو بڑی شدّت کے ساتھ ۱۹۳۵ء تک جاری رہی۔ ۱۹۳۵ء میں ہمیں اصلاحات کی دوسری قسط ملی اور اسلامیانِ ہند کی علیحدہ قومیت کے تسلیم کیے جانے کا مطالبہ شدت سے شروع ہوا۔ اس سلسلے میں اقبالؔ خود بھی لندن کی گول میز کانفرنس میں شامل ہوتے۔ اور واپسی میں ہسپانیہ کی سیر، فلسطین کی زیارت اور مسولینی کی ملاقات سے متاثر ہوئے۔ اور ۱۹۳۸ء میں جب کہ قائد اعظم اور سر سکندر حیات کے درمیان نصب العین کی جنگ برپا تھی۔ وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

اس تیس سال کے عرصے میں دنیائے اسلام جن مسائل، جن انقلاباتِ ذہنی و فکری اور جن حوادثِ ارضی و سماوی سے متاثر ہوئی ان سب کا سراغ نہ صرف ہمیں مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ بلکہ میری ناچیز رائے میں وہ موقف بھی مختلف کیفیتیں اختیار کرتا چلا جاتا ہے جس پر انہوں نے اپنے تصورِ ملت کی بنیاد رکھی۔ طوالت کے خوف سے میں یہاں صرف چند مثالیں دینے پر اکتفا کروں گا۔

ملت کا اولین تصور اقبال کے ہاں بالکل سادہ، مختصر اور قطعی ہے عبدالقادر کے نام اپنے پیغام میں کہتے ہیں ؎

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلےٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

اور پھر اس کے ساتھ ہی کی دوسری نظم میں ارشاد ہوتا ہے ؎

یہاں کہاں ہم نفس میسّر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے۔ مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اب ذرا آگے بڑھیئے اور بلادِ اسلامیہ کی معرکہ آرا نظم پر ایک نظر ڈالیے۔ یہاں اسلامی دنیا کی مٹی پھر ان کی دامن گیر ہوتی ہے۔ اور وہ جذبہ پھر سے جاگ اٹھتا ہے جسے انہوں نے عالمگیری ملت کی لوری سنا سنا کر بڑی مشکل سے سلایا تھا۔ اور وہ ایک ایک کر کے دلی اور بغداد اور قرطبہ و قسطنطنیہ کی عظمت رفتہ کا نوحہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سر زمیں دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سر زمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد
ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہاں آباد بھی
اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
جس کے غنچے تھے چمن ساماں وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جس سے روما ان کا مدفن ہے یہی

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملّتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدیِ امّت کی سطوت کا نشانِ پائدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
اے مسلماں ملّتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

اور پھر ؎

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماوٰے ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے۔ تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اقبالؔ کا طالب علم جب ان کی وطن بے زاری کے اوّلین مظاہر دیکھنے کے بعد بلادِ اسلامیہ سے ان کی والہانہ عقیدت سے آشنا ہوتا ہے

اور دلّی اور قرطبہ کی خاک سے انہیں جذباتی تعلق ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ لگاتا ہے اور قسطنطنیہ کو ملّت اسلام کا دل مان کر اور یثرب کو مسلم کا آخری ملجا و ماویٰ جان کر وہ اس ارشاد قدسی کو بھی یاد کرتا ہے کہ اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب تو وہ ایک لمحے کے لئے وطن اور ملّت کو لازم و ملزوم سا سمجھنے لگتا ہے اور اسے ایک کا تصور دوسرے کے تصوّر سے کچھ ہم آہنگ سا محسوس ہونے لگتا ہے اور اس کی روح میں شاعر کے اس قسم کے ارشادات جگمگا اٹھتے ہیں کہ ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

لیکن کلامِ اقبالؔ کے چند ہی ورق الٹنے پر جب اس کی آنکھیں یکایک اس نوع کے اشعار پر پڑتی ہیں کہ ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

اور ان پر کہ ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

اور ان سے ذرا آگے بڑھ کر شاعر کی اس صدائے دل نواز پر کہ ؎

تو ابھی راہ گذر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر
کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

اور پھر اس اقرار آمیز سعی تسکین پر کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

اور آخر میں شاعر کی اس قسم کی پیش گوئیوں پر جو بظاہر سیلِ زمانہ کی خوفناک رفتار سے متأثر ہیں کہ ؎

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

تو وہ ایک عالمِ حیرت میں اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے اور سوچتا ہے کہ یا تو وہ خود گم کردہ راہ ہے یا شاعر نے چپکے سے اپنا مقام بدل لیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں دونوں باتیں درست ہیں۔ طالبِ علم جب

شاعر کے گنبدِ سخن میں قدم رکھتا ہے۔ تو اس کی صداؤں کے زیر و بم میں واقعی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور خود ضمیرِ شاعر کی ہنگامی اور ہر آن بدلتی ہوئی کیفیت اس کے اس اپنے شعر سے بہتر طور پہ بیان نہیں ہو سکتی کہ ؎

اقبالؔ کبھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

بلادِ اسلامیہ اقبالؔ کی نظر میں

بیسویں صدی کے آغاز میں جب اقبالؔ نے غزل کے اس کوچے سے قدم نکالا جس کی فضائیں داغؔ اور امیرؔ کے زمزموں سے گونج رہی تھیں تو نظم کا ایک لہلہاتا ہوا سبزہ زار اپنے سامنے پایا۔ وہ اپنی اعلیٰ مغربی تعلیم کی بدولت انیسویں صدی کی انگریزی منظومات سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو چکے تھے۔ اور خود اپنی زبان میں قومی اور فطری شاعری کا آغاز ان کے پیش نظر تھا۔ لیکن ازبس کہ وہ مبدارِ فیاض سے ایک فکرِ بلند پرواز اور تخیل "تابناک لے کر آئے تھے۔ اور ایک لطیف رعنائی اظہار بھی انہیں ارزانی ہوئی تھی، اس لئے نہ تو انہوں نے شیلے اور بائرن کی پیروی کی اور نہ حالیؔ و آزادؔ کو اپنا رہبر بنایا۔ بلکہ ان کا طائرِ فکر اپنی ایک ہی اڑان میں ان کی روحِ سخن کو بلندیوں کی طرف لے اڑا

جواں کے وطن کی مقدس رفعتوں کی ہمسر تھیں۔ ان کی پہلی نظم جوان کی عظیم ترین نظموں میں سے ہے، ان کے اس رجحان طبعی کی پوری آئینہ داری کرتی ہے۔ یہ نظم عین اس وقت لکھی گئی جب انیسویں صدی بیسویں صدی کو کروٹ دے رہی تھی۔ اور شاعر کا ضمیر ایک حیات تازہ کی آمد آمد سے متاثر ہو رہا تھا۔ سر سید کی بانگِ رحیل اسلامیان ہند کے کارواں کو بیدار کر چکی تھی۔ لیکن گزری ہوئی شب تار کی کیفیتوں نے ابھی انہیں اس غبارِ نوریں کو سر اٹھا کر دیکھنے کا موقع نہیں دیا تھا جس سے ان کے وطن کا مطلع مطلعِ انوار ہو رہا تھا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ سر سید نے مسلمانوں کو ان کی گہری نیند سے جگانے اور اپنے احوال کی درستی کی طرف مائل کرنے میں ایک بے مثال کاوش سے کام لیا تھا۔ اور ان کی یہ سعی، ان کے اور ان کے رفقائے کار کے خلوص کی بدولت اس حد تک مشکور ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ عملی طور پر انگریزی تعلیم اور انگریزی ملازمت کو اپنی دنیوی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگ گیا تھا۔ اور ان مشاغل میں مصروف ہو چکا تھا جو کسی سنبھلتی ہوئی قوم کی ابتدائی اور سراسر سماجی ترقی کے وسائل میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن قومی زندگی کے اس روح پرور احساس سے جسے استخلاص وطن کا جذبہ جنم دیتا اور پرورش کرتا ہے وہ ابھی اجنبی تھا۔

اقبال نے اپنے سوز کلام سے قوم کو پہلی بار اس سے آشنا کیا اور حبِ وطن کو اس کے فروغ کا ضامن ٹھہرایا۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے۔

کہ سن ستاون کی شکست کے بعد اسلامیانِ ہند پر جو سیاسی جمود غالب آچکا تھا، اسے دور کرنے میں اقبالؔ کی وطن پرستانہ شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمالہ اور اس کے بعد نیا شوالہ اور پھر ترانۂ ہندی اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ان سب سے بڑھ کر تصویرِ درد اقبالؔ کی وہ بے مثال نظمیں ہیں جو ابدی قدر و قیمت رکھتی ہیں اور جنہوں نے اسلامیانِ ہند کے دلوں میں ان کی حکومت کے خاتمے کے بعد پہلی بار حبِ وطن کی چنگاری روشن کی اور غلبۂ فرنگ کے خلاف ایک احتجاج خاموش پیدا کیا۔

میری ناچیز رائے میں اقبالؔ کی وطنی شاعری کی نمود مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں پہنچ کر ہم نے ایک دفعہ پھر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اور جس آسان راستے پر سر سید اور ان کے رفقاء ہم کو چالیس برس پہلے ڈال گئے تھے۔ اس کی نشیبی ڈھلوانوں پر ایک نگاہِ بے محابا ڈالی۔ شاعرِ ہندوستان وطن کی رسیلی فضاؤں میں ڈوب کر وہ نغمے تخلیق کر رہا تھا۔ جو ایک طرف ہمارے ادراک حسن اور جذبۂ الفت کو تیز تر کرتے تھے۔ اور دوسری جانب ہمیں اپنی غلامی اور فرومائیگی کا شدید احساس دلاتے تھے۔ جہاں اس نے یہ کہہ کر ہماری رگوں میں خون کی روانی تیز کی کہ ؎

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینہ

رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

وہاں اس کے رباب غم سے یہ نالۂ پر زور بھی نکلا کہ ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

اور پھر یہ کہ ؎

مجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر آشیاں اپنا
چمن میں آنا کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اور آگے چل کر یوں کہ ؎

بیابانِ محبّت، دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے
اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے
سکوں آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

اقبال کا یہ پیرایۂ سخن اپنے عروج پر تھا کہ اسے تکمیل تعلیم کے سلسلے میں یورپ کا سفر درپیش آیا۔ اور پھر یورپ کے مختلف ممالک خصوصاً انگلستان اور جرمنی میں ایک طویل قیام کا موقع ملا۔ جرمنی کے روح افزا مناظر نے ان کی شاعرانہ طبیعت میں وہ نکھار پیدا کیا جس کا اثر ان کے کلام میں دور تک ملتا چلا جاتا ہے از بسکہ جرمنی ایک نوزائیدہ مملکت تھی اور سیاسی طور پر وہ کبھی اسلام یا ہندوستان سے براہ راست پنجہ آزما نہیں ہوئی تھی، اس لئے دوران قیام جرمنی میں ان کے فکر شعری نے فطری طور پر کوئی ایسا رنگ اختیار نہیں کیا جس میں ملت یا وطنیت کی جھلک ہوتی۔ جرمنی میں وہ شاہدِ قدرت کے جمالِ جہاں آرا یا کبھی کبھی کسی غیر معمولی حسنِ انسانی کے جلوۂ جاں افروز سے متاثر و محفوظ ہوتے رہے۔ چنانچہ اس زمانے کی نظموں میں یہی تاثرات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ "کسی کی گود میں بلی دیکھ کر" اور "ایک شام" اسی عہد کی یادگار نظمیں ہیں۔

انگلستان کے افراد بڑے انہماک سے انفرادی اور قومی تعمیر کے بڑے بڑے منصوبوں کی تعمیر میں مصروف تھے اور دولت انگلشیہ روما کی آسمانی اور عرب و عجم کی اسلامی حکومت کی وارث و جانشیں بن کر اپنی حدود جہاں بانی کو کرۂ ارض کے آخری گوشوں تک وسیع کئے جارہی تھی۔ غرض مغرب اس زمانے میں بظاہر پرامن لیکن بہ باطن ایک خوفناک جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور جارحانہ قومیت کا نظریہ ایک طرف جرمنی اور فرانس اور دوسری طرف انگلستان میں نشو و نما پا رہا تھا۔ چنانچہ شاعر کی طبع حساس اس سے بدرجۂ غایت متأثر ہوئی۔ اور وہ نہ صرف اپنے دل کو ٹٹولنے بلکہ اپنے فکر کو از سرنو بروئے کار لانے پر مجبور ہوگیا۔ یورپ کی وطن پرستی اور قوم پروری کا پورا نقشہ اس کے سامنے تھا۔ اور وہ یہ بات شدید طور پر محسوس کر رہا تھا کہ یورپ کی وطنیت انسانیت کے اس تصور کے عین مخالف ہے۔ جو امن عالم کے لئے نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہے اور یہاں سے اس کا ذہن بہ یک جست اس حقیقت کبریٰ کی طرف منتقل ہوگیا کہ انگلستان کی سیادت اور ہندوستان کی غلامی تو محض علامتیں ہیں۔ اس عالمگیر کشمکش کی جو ایک مادیت نواز تہذیب اور انسانیت کی روندی ہوئی اقدار میں جاری ہے اور ان اقدار کو زندہ کرنا اور اس کی مردہ ہڈیوں میں روح پھونکنا ایک ہی نظام کا کام ہے اور وہ نظام تعلیم اسلام ہے۔ جس کی نوید تیرہ سو سال پیشتر پیغمبر اسلام نے عالم انسان کو دی تھی۔ اور جسے دو لفظوں میں "اخوت انسانی" کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

یہ احساس عظیم شاعرِ مشرق کی شاعری کی شاہ راہ پر دوسرے اور سب سے اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہاں سے اس کا کاروانِ سخن وطن کی شاداب و پُربہار وادی سے نکل کر ملت کے صحرائے لبسیط میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کا ہر قدم اسے وطن کی دل کش فضاؤں سے دور لے جاتا اور ملت کی پہنائیوں میں گم کرتا چلا جاتا ہے۔

اور جب اقبالؔ مغرب سے لوٹ کر اپنے وطن میں پہنچے تو اُن کے افکار کی یہ کیفیت نہ صرف بدستور قائم رہی بلکہ پختہ تر ہوتی چلی گئی چنانچہ اپنی مراجعت کے ایام میں انہوں نے عبدالقادر کے نام جو پیامِ منظوم لکھا ہے اس میں اس انحراف یا ارتقاء کے واضح آثار پائے جاتے ہیں جو ان کے شعر میں وطن سے ملت کی طرف مسلسل جاری تھا۔ فرماتے ہیں ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رُخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اور پھر یہ داغ جو پہلے پہل شاعر کو سردیٔ مغرب میں محض گرم رکھتا تھا، اس انداز سے بڑھا کہ بڑھتے بڑھتے آفتابِ نصف النہار کا حریف ہوا. اور وطن پرستی شاعر کے ضمیر سے اس طرح نکل گئی جیسے وہ یہاں کبھی وجود پذیر ہی نہیں ہوئی تھی. اور وہ اقبالؔ جو کبھی فرنگ کی سحر آگیں فضاؤں میں بھی وطن اور محبوبانِ وطن کی یاد سے مجبور ہو کر بے اختیار پکار اٹھا تھا کہ ؎

یوں تو اے بزمِ دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
میں نے اے اقبالؔ یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی

بالآخر وطن اور اس کی دلکش کیفیتوں سے اس حد تک بے گانہ ہو گیا کہ جس تصور سے پہلے وہ زندگی کا قصرِ زرنگار تعمیر کرتا تھا. وہی تصور اب اسی زندگی کے مزار کی تعمیر میں صرف ہونے لگا ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

لیکن جب تک یہ رنگ پوری طرح جما نہیں تھا۔ شاعر ایک عجیب قسم کی روحانی کش مکش میں گرفتار رہا۔ اس کے ذہن میں وطن کا تصور ایک جامد واضح اور جیتا جاگتا تصور تھا۔ اور وطن کی محبت بہاؤ کی نکھری ہوئی چاندی کی مانند تھی جس کے پرتو سے اس کی دنیائے سخن جگمگا رہی تھی اس کے برعکس وحدت ملت کا تصور اس کے فکر و وجدان کی ایک ارتقائی منزل کا درجہ رکھتا تھا جو نہ نظر آتی تھی نہ محسوس کی جا سکتی تھی بس ایک سرمدی آواز تھی کہ چلی آ رہی تھی۔ ایک غیر مرئی چشمہ تھا کہ ابل رہا تھا۔ بس ایک نامحسوس قوت تھی کہ شاعر کے توسن فکر کو ایمان و ایقان کی شاہراہ پہ رواں کر رہی تھی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ ردعمل کی یہ شدید کیفیت کلام اقبال کے

اوّلین دور سے خاص ہے اور شاعر کے وجدان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے اجتماع میں بھی شیرینی اور دلکشی کے عناصر فروغ پاتے گئے۔ چنانچہ شعر اقبالؔ کے متوسط اور آخری دور میں اس مشہور قطعے کے سوا کہ ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

ملت اور وطن کے موضوع پر جو افکار ہمیں ملتے ہیں، ان کی پختگی اور دل رسی سے انکار ممکن نہیں اور اظہار کا انداز بھی بدرجۂ نمایاں تعمیری ہوتا چلا گیا ہے ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

اتحادِ اسلامی کی اس سے جمیل تشبیہہ کا تصوّر محالات میں سے ہے اور ظاہر ہے کہ شاعر اتحادِ ملت کے نصب العین کو پیش کرتا ہے۔ اس کا پیکر مادی یا ملکی نہیں، بلکہ یکسر فکری اور ثقافتی ہے اور اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ اس خصوصیت کو اقبالؔ کی ملی شاعری میں از سرتاپا جاری و ساری دیکھیں گے۔ اور یہاں یہ نکتہ لطیفہ پیدا ہوتا ہے۔ اور

اس کی شہادت میں کلامِ اقبالؔ کے اوراق ہر اہلِ نظر کے لئے کھلے ہیں۔ کہ شعرِ اقبالؔ کا وطن سے ملّت کی طرف انحراف دراصل اس ارتقائی عمل کی حیثیت رکھتا ہے جو اس نے جذبے سے فکر کی طرف پیش قدمی کرنے میں اختیار کیا۔ وطن اس کا دامن کشِ دل تھا۔ لیکن ملت اس کے ذہن و نظر پہ حاوی تھی۔ اور اگرچہ اس کی شاعری کے عہدِ عروج میں اس کا ایوانِ سخن ملت کی ظفرمندی کے زمزموں سے گونجتا رہا۔ لیکن اس کے قلب کی خلوتیں اور اس کی روح کی پہنائیاں اس بے پناہ کش مکش سے معمور رہیں۔ جو شاعر کی وطن سے محبت اور ملت سے عقیدت کے درمیان مسلسل جاری تھی۔

اقبالؔ نے شعوری طور پر اس کش مکش کا نہ احساس کیا، نہ اعتراف، لیکن اس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں کہ غیر شعوری طور پہ یہ کش مکش ان کی شاعری پہ بڑی شدّت سے اثر انداز ہوئی اور رہ رہ کر تضاد و تخالف کے ان مظاہر میں رونما ہوتی رہی جو ان کی ملّی شاعری کے معمّات میں شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک ہی وقت میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند!
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

اور یہ بھی کہ ؎

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

پھر ایک جگہ ارشاد ہے کہ ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ افرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اور ساتھ ہی یوں بھی فرمایا ہے کہ ؎

تو ابھی رہ گزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر
کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشاد شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

نیز یہ کہ ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

پھر فرمایا کہ ؎

ایک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

لیکن ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

میری ناچیز رائے میں جب شاعر کا شعوری فکر تضاد و تخالف کی اس کیفیت میں سے گزر رہا تھا، عین اسی وقت اس کا لاشعور اس کے جذبات و افکار کے درمیان ایک معنی خیز مصالحت کی تکمیل میں مصروف تھا۔ اور جب وہ خوش نصیبی سے اس میں کامیاب ہوا تو اس شعرِ دل کش و دل نشیں کی آفرینش ہوئی جو اقبالؔ کی شاعری میں بلادِ اسلامیہ سے منسوب ہے۔ اقبالؔ کی یہ صنفِ شعر، جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ اس کی وطنی اور ملّی شاعری کی شاہراہوں پہ ایک حسین و جمیل مقامِ اتصال ہے۔ جہاں پہنچ کر اس کی درماندہ روح بالآخر ایک تسکین تام سے ہمکنار ہوئی۔ اقبالؔ نے ایک جگہ خود اپنی شخصیت کا تجزیہ یوں کیا ہے ؎

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریم حجاز و نوازِ شیراز است

یہ شعر اس مسکنِ اسرار کی کلید ہے جس میں اس کی شاعرانہ شخصیت نے اپنے فروغ دار تقا کے بیشتر مراحل طے کئے۔ اقبالؔ جبلی طور پر ایک وطن پرست تھا اور اس کی وطن پرستی گلشن کشمیر سے لے کر وادیٔ گنگ و جمن اور دامانِ ہمالہ سے لے کر نواحِ گولکنڈہ تک دامن دراز تھی۔ اس کی اپنی

خاک کا خمیر مایہ اسی خاک پاک سے اٹھا تھا۔ اور اس کے قلب کا اضطراب اسی کی محبت سے مستعار تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی جبلّی ودیعتوں پر اس کی نظری کیفیتیں غالب آگئیں۔ لیکن یہ غلبہ ان ودیعتوں کو مٹا نہ سکا۔ فقط ان کی ہیئت تبدیل کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہوا اور یہ تبدیلیٔ ہیئت اقبالؔ کی اس شاعری کا آغاز و انجام ہے۔ جہاں وطن کی پرستش ختم اور ان دیار و امصار کی یاد خوانی شروع ہوتی ہے۔ جنہیں اسلام کے سیل رواں نے اپنی یلغاروں میں سیراب کیا۔ اور اپنی سیرابیوں کے نشانات وہاں چھوڑے۔ اقبالؔ کا اپنا وطن بھی اگرچہ انہیں بلاد میں شامل تھا جس کی رفعتوں پر کسی زمانے میں پرچم اسلام لہرا چکا تھا، لیکن شاعر خود جس سیاسی دور میں سانس لے رہا تھا۔ اس کے تقاضوں نے اس کے ذہن و قلب اور اس کے افکار و جذبات کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جسے وہ اپنے جیتے جی منہدم نہ کر سکا۔ لیکن ردعمل کے طور پر اس نے دیار اسلام کے ان ویرانوں میں سر بہ فلک قصر ضرور تعمیر کیے جن کی فضائیں شمشیر مجاہد کی جھنکاروں اور نغمۂ حرم کی لرزشوں سے شام ابد تک معمور رہیں گی۔

ان ویرانوں میں اندلس کا ویرانہ اس کا محبوب ترین ویرانہ ہے، اگرچہ سسلی کے کوہ و دشت اور گولکنڈہ کے کھنڈر بھی اسے کچھ کم عزیز نہیں ہیں۔ دجلہ کی وادی، ماموراکی شاخ زریں اور جمنا کا کنارہ بھی اس کے دامن دل کو بے طرح کھینچتا ہے۔ لیکن اس کی روح کا آخری ملجا اور اس کی

امیدوں کا آخری سہارا حجاز کی سرزمین ہے جس کی پاسبانی کے لئے وہ ایک عالمِ اضطرار میں بے اختیار اٹھتا ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

بلادِ اسلامیہ سے اقبالؔ کی اوّلین آشنائی ایک غمناک کیفیت سے معمور ہے۔ وہ سسلی کے ساحل پر اسلام کی عظمتِ رفتہ کی یاد میں خون کے آنسو روتا ہے۔ اور نہ کسی تسکین کا جویا ہوتا ہے نہ کسی تشفی کا طالب اور اپنے غم ہی کو اپنی روح کی غذا بنا لیتا ہے ؎

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبالؔ کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں نرا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

حزن و یاس اور قنوطیتِ لازوال کی یہ کیفیت گورستانِ شاہی کے اس مرقعے میں کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی ہے جو شاعر نے گولکنڈے کے قلعے میں تیار کیا ہے. یہاں وہ قلعے کے کھنڈروں میں ایک قوم کے ایک جمالی مستقبل کا خواب دیکھتا ہے اور اگرچہ حیاتِ انسانی کی بے بضاعتی اور دولت و سطوتِ شاہانہ کی بے اعتباری اس سے خراجِ اشک وصول کرتی ہے. لیکن ایک تابناک مستقبل کا تصورِ دلفریب اس کے لبوں پر ایک دل آویز تبسم بھی پیدا کر دیتا ہے ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادیٔ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

بلادِ اسلامیہ کے نام سے خود شاعر نے اپنی شاعری کے اوّلین دور میں جو نظم لکھی ہے، اس میں دلّی کو خانقاہِ عظمتِ اسلام کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور اس کے ایامِ عروج کی یاد میں رسمِ دلگدازی کو یوں ادا کیا ہے کہ ؎

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

اسی طرح بغداد کی نسبت اس کے خامۂ خونچکاں نے کچھ اس انداز سے لالہ کاری کی ہے کہ ؎

جس کے غنچے تھے چمن ساماں وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما ان کا مدفن ہے یہی

اور فکرِ مشرق، مغرب پارۂ قسطنطنیہ کو اسی طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ ؎

صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا

اے مسلماں ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

یہاں ہم اس بحث کے لئے نہیں رکیں گے کہ اقبال کے معروف نظریات کے مطابق ملت اور ملت کے دل کو کسی شہر سے کیا نسبت ہے۔ اور اگر آج شاعر اسلام زندہ ہوتا تو ملت اسلامیہ پاکستانیہ کے دل یعنی شہر لاہور کو اس کے محبوب بلادِ اسلامیہ کی پیلک گوہر میں کون سا درجہ ملتا، بلکہ ہم چپکے سے آگے بڑھ جائیں گے اور تخیل کی ایک ہی پرواز سے اس سرزمین میں جا اتریں گے جہاں آج سے بارہ سو برس پہلے طارق کا سفینہ اپنے آخری کنارے سے آلگا تھا۔ اندلس کی سرزمین شاعر اسلام کی آخری محبوبہ ہے اور پختہ سال شاعر نے اس سے اپنے عشق کی شرح میں فن کی جن بلندیوں کو چھوا ہے وہ اب ہمیشہ تک اچھوتی ہی رہیں گی۔

شاعر نے یہ نغمے غرناطہ کی عطر بیز ہواؤں اور وادی کبیر کی کیف انگیز فضاؤں میں خود ڈوب کر لکھے ہیں۔ اس نے مسجد قرطبہ کے صحن میں بیٹھ کر گردشِ ایام کو بارہ صدیاں پیچھے کی طرف دوڑایا ہے اور اپنی سانس مجاہدین اسلام کی حرارت آفریں سانسوں سے اور اپنی نظر مہوشانِ الحمراء کی معصوم نظروں سے ملائی ہے اور پھر سے اس عہدِ زریں کو زندہ کیا ہے جو تاریخ عالم کے اوراق میں ابدالآباد تک تابندہ و درخشندہ رہے گا۔ مسجد قرطبہ اقبال کی پختہ تر شاعری میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے اور اس کے بعض مقامات یقیناً دنیا کی عظیم ترین شاعری میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ چند

شعر ملاحظہ ہوں ؎

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہہ جبرئیل
کعبۂ اربابِ فن، سطوت دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار
حاملِ خلقِ عظیم صاحبِ صدق و یقیں

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اُندلسی
خوش دل وگرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اور اب گریز ملاحظہ ہو ؎

وادیٔ کہسار میں غرق شفق سے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

یہاں پہنچ کر مجھے شاید یہ اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ شاعر جس زمینِ حقیقت نہاد کو ٹھکرا کر فکر کے پروں پر فضائے تصورات

میں بلند ہوا تھا. بالآخر اسی زمین پر واپس آیا اور اسی سے ایک حیات تازہ کی نوید کا طالب ہوا. زمین آخر زمین ہے خواہ وہ وطن کی ہو یا ملت کی اور انسان آخر انسان ہے خواہ وہ فلسفی ہو یا شاعر اور وہ شاعرِ عظیم جس کی یاد میں ہم یہاں جمع ہیں اگر آج زندہ ہوتا تو وہ اپنے آزاد وطن اور گریزاں ملت کے بظاہر متضاد نظریے کی کیا تاویل پیش کرتا ـــــ کون کہہ سکتا ہے!

پھر وطنیّت کی طرف

پاکستان کے قیام سے پہلے اسلامیانِ ہند کے دل جس جذبے سے سرشار تھے وہ وحدتِ ملّت کا جذبہ تھا۔ اور اگرچہ اس جذبے نے ہمارے فکر و شعور سے وطنیت کو یکسر مٹا دیا۔ لیکن یہی جذبہ بالآخر ہمارے قومی وطن کے قیام کا باعث بنا۔ تاریخ کا یہ ایک حیرت انگیز معمّہ اور ایک گہرا راز ہے جسے پوری صحت اور قطعیت سے حل کر لینا ممکن نہیں۔ بہرحال جہاں تک ہماری زندگی کے موجودہ تقاضوں کا تعلق ہے۔ آج اس بات کا فیصلہ کر لینا نہ صرف موزوں بلکہ ضروری ہے۔ کہ ہمارا قومی نصب العین کیا ہے۔ یا اس کے حصول کا سیدھا راستہ کون سا ہے اور ہماری وطنیت اور ملّت اس کی کس حد تک معاون یا مخالف ہو سکتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اسلامی ہند میں جذبۂ ملّت کا فروغ

اور پھر اس فروغ کے نتیجے میں ایک قومی وطن کی آفرینش بظاہر ایک تاریخی معمّے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے قیام سے کم وبیش ربع صدی بیشتر اس مردِ عظیم کے افکار جس نے ہمیں پاکستان کا تصور دیا۔ وطن اور وطنیت کے استخفاف کو مسلسل اپنا محور بنا رہے تھے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیادت تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

پھر فرمایا کہ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

پھر ارشاد ہوا کہ ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بے کراں کے لئے

لیکن جب مفکرِ اسلام نے اپنے شاعرانہ الہامات کی موجودگی میں ایک وقفہ قلیل کے لئے مسلمانانِ ہند کے لئے عملی سیاست کی طرف اپنی توجہ مبذول کی تو انہیں شمال مغربی ہندوستان نے ایک اسلامی حل کے قیام کی دعوت دی یہاں میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ یہ دعوت جمرود سے لے کر راس کماری تک تمام اسلامیانِ ہند کے لئے تھی یا فقط صرف انھیں اقطاع کے باشندوں کے لئے جو دریائے سندھ سے لے کر دریائے جمنا تک آباد تھے۔ اور وہ خواب جسے ٹیپو سلطان نے بھی دیکھا اور عبدالحمید خاں ثانی نے بھی جمال الدین افغانی نے بھی دیکھا اور خود مفکرِ اسلام علامہ اقبالؔ نے بھی کس تعبیر کا شرمندہ ہونے والا تھا۔ لیکن ایک بات بالکل صاف اور عیاں ہے۔ اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملت اور مقاصدِ ملّت کے امکاناتِ فروغ کے سلسلے میں جب شاعرِ مشرق نے جذبات سے انکار کی طرف انحراف کیا تو اسے مومن کی ترکِ تازہ کے لئے اس جہاں کی وسعتیں اور رفعتیں کے لئے جینے

کے سفر کے لئے بحرِ امکان کی ناپیدا کناریاں بے کار اور بے معنی نظر آئیں اور اس نے اپنے تاریخی خطبے میں مسلمانوں کو اس ملک کے شمال مغربی کونے میں ایک قومی وطن کی تاسیس و تشکیل کی دعوت دی۔ شاعر آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں سے اتر کر زمین کے ایک تنگ ٹکڑے کی حدود میں ملت اور اس کے مفاد کو محصور و محدود کرنے پر نہ صرف آمادہ ہو گیا بلکہ اسی میں اس کو اس کی نجات بھی نظر آئی۔

زمین آخر زمین ہے، اور ہمارے تخیل کی ہزار پروازیں اور ہماری آرزؤں کی ہزار رفعتیں بھی اسے آسمان نہیں بنا سکتیں۔ اور حقیقت کی دنیا میں ہمیں آسمان سے بہت زیادہ ضرورت بھی زمین ہی کی ہے۔ "تاکہ آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو۔ اور اللہ کی اس زمین پر اس کے فرمانبردار بندے متصرف ہو کر اسے اپنا وطن بنائیں۔ اور اس وطن کی حفاظت میں اگر ضرورت پڑے، تو اپنی جانیں اور اپنا مال اور اپنی اولاد قربان کر دیں۔

اقبال نے جب ہمیں پاکستان کا تصور دیا تو یہ بلاشبہ اس کے آفاق گیر تصورِ ملت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کی رجعت ایک حقیقت پرستانہ رجعت تھی۔ ملتِ اسلامیہ ہند کو اپنے تحفظ اور اپنے فروغ کے تقاضے پورے کرنے کے لئے کسی بحرِ بے پایاں یا کسی آسمان بے کراں کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ایک ایسے خطۂ زمین کی حاجت تھی جس میں سما کر یا سمٹ کر، پھیل کر یا بٹ کر اُسے ایک آزاد اسلامی زندگی بسر کرنی تھی۔

خداوند کے فضل و احسان سے ہماری یہ ضرورت ایک حد تک پوری ہوئی

یہاں اس بحث میں الجھنا بے سود ہوگا کہ ہم میں سے کتنے اس نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے۔ لیکن جس قدر بھی بہرہ مند ہو سکے ان کے لئے نجات و فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ وطن کی والہانہ محبت کے مرغزار میں ہو کر نکلتا اور اس فوزِ عظیم کی طرف بڑھتا ہے۔ جو مومن کی منزل مقصود ہے۔

جب اپنے ملّی مفاد کی حفاظت اور اپنے ملّی مقاصد کے فروغ کے لئے ہم نے ایک وطن حاصل کر لیا ہے۔ خواہ وہ ہم سب کے لئے کافی ہے یا ناکافی تو منطقی طور پر ہمارے لئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کو تمام دیگر فرائض پر ترجیح دیں۔ کیونکہ نہ صرف ہمارے اعمال حسنہ، نہ صرف ہمارے مقاصد ملّی، بلکہ خود ہماری ہستی ہماری جانیں اور ہمارے جسم، ہمارے گھر بار، ہمارے مواقع، اور ہمارے امکانات اس کی سلامتی سے وابستہ ہیں۔ اگر ہمارا وطن قائم رہے گا تو ہمیں خدمت دین اور تعمیر ملت کے موقعے بھی ملیں گے۔ ہم اعلائے کلمتہ اللہ بھی کر سکیں گے اور حقوق انسانیت بھی ادا کر پائیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ وطن کو ضعف پہنچا یا ملک پر آفت آئی، تو نہ ہم بچے رہیں گے اور ہماری مسلمانی اور خاکم بدہن، ملک کا زوال ملت کا زوال بن جائے گا۔

جہاں تک اس برّاعظم کا تعلق ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارا محاذ یکسر بدل چکا ہے۔ اب وطن اور ملّت کے مفاد متضاد نہیں رہے۔ بلکہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اور ایک کا فروغ دوسرے کی ترقی کا ضامن ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم پر ایک نئی ذمہ داری بھی عاید ہو گئی ہے اور وہ ہے

ایک کروڑ غیر مسلم پاکستانیوں کی ذمہ داری۔

ظاہر ہے کہ قیام پاکستان میں ان کی کسی قسم کی آرزوؤں نے حصہ نہیں لیا بلکہ وہ خود بخود اس کے حصے میں آگئے ہیں۔

انہیں مفید شہری بنانے کے لئے اور ان کے اور اپنے درمیان ایک بنیادی ہم آہنگی اور ہم مقصدی کے لئے لازم ہے کہ ہمارے سامنے ایک ایسا مشترکہ نصب العین ہو جس کے تقدس سے نہ انہیں مجال انکار ہو، اور نہ ہمیں یارائے انحراف، ظاہر ہے کہ یہ نصب العین وطن پروری اور وطن دوستی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

یہی نصب العین ان کی وفاداری کا ضامن اور مملکت کی سلامتی کا سہارا ہوگا۔ اور اسی وجہ سے ملک کی اکثریت اور اقلیت ہاتھوں میں ہاتھ دیئے آگے بڑھیں گی اور ملک کی فلاح و بہبود میں برابر کا حصہ لیں گی۔

اب کہ ہم آزاد ہیں۔ ہماری وطن دوستی ہمارے ملی روابط پر نہ غالب آئے گی اور نہ انہیں نقصان پہنچائے گی۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم شاعر اسلام کی اس آواز کو بر لانے کے لئے ہمیشہ سر بکف رہیں گے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر

رومی اور اقبال کا مشترک نظریۂ حیات

عشق

مولانا روم کا شمار مشرق کے ان عظیم انسانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی روحانی قوت سے نہ صرف اپنے عہد کے افکار و اخلاق کو متاثر کیا، بلکہ عالم انسانیت کے لئے ایک ایسا روحانی ترکہ چھوڑا جس کی اقدار ابدی اور جس کا جذب جاوداں ہے اور جس کا سوز اور جس کا فروغ روحِ انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ تک تپش اندوز اور فروزاں رکھے گا۔

مولانا جلال الدین رومی بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے۔ بلکہ ایک مردِ مومن تھے۔ جنہیں علم و فکر ذوق و شوق، سوز و خلوص اور کلام و بیان کے خزائن عامرہ میں سے ایک بہرۂ عظیم عطا کیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی خود اپنی زندگی کو ان مقاصد عالیہ اور ان اقدارِ جلیلہ سے ہم آہنگ کرنے کی توفیق بھی ارزانی ہوئی تھی، جن کا فروغ ان کا منتہائے نظر تھا۔

وہ ایک عالمِ بے بدل اور فاضل اجل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مومنِ کامل بھی تھے ۔ ان کی زندگی ایمان کی حرارت سے فیض یاب اور خلوص کی نعمت سے مالامال تھی۔ شمس تبریز کی توجہ اور اصلاح الدین زرکوب کی صحبت سے جلال وجمال کی جو کیفیتیں ان کی فطرت صالح نے جذب کیں وہ اُن کے کلام میں کہ اسی ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس انداز سے منعکس ہوئیں کہ سات صدیاں گزرنے کے بعد مثنوی مولوی معنوی آج بھی مجازاً "قرآنِ پہلوی" کا درجہ رکھتی ہے اور دیوانِ رومی آج بھی عاشقانِ باصفا اور محبانِ بے ریا کے لئے بمنزلہ صحیفۂ زندگانی ہے۔

شمس تبریز تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مولانا کے مرشد تھے اور مولانا کے دیوان کی بیشتر غزلیں انہی کے نام سے منسوب ہیں۔ جب تک مولانا ان سے نہیں ملے تھے، وہ ایک عالم بے بدل تو ضرور تھے لیکن ان کا علم سرسبز نہیں ہوا تھا۔ ملائیت کی خنکی اس میں باقی تھی۔ شمس تبریز کی ملاقات کے بعد مولانا کو حرارتِ قلب میسر آئی جو علم نہیں بلکہ عرفان کی سرمایہ دار ہوتی ہے۔

صلاح الدین زرکوب مولانا کے ایک رفیق طریقت تھے، جن سے مولانا کی ملاقات کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ قونیہ کے بازارِ صرافہ میں صلاح الدین چاندنی کے ورقوں کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ ایک روز اپنی دوکان میں بیٹھے تھے اور اپنے شاگردوں کے ساتھ ہتھوڑوں سے ورقوں کی دستیاں کوٹ رہے تھے کہ مولانا کا اس طرف سے گزر ہوا۔ مولانا چلتے چلتے رک گئے۔ چوبی ہتھوڑوں کی آواز ضرب میں ایک آہنگ تھا کہ اپنے زیر و بم میں آہنگ

فطرت کا پیام رکھتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا کا دل شمس تبریز کی حرارت بخش توجہ سے حد درجے گداز ہو چکا تھا۔ ہتھوڑوں کی آواز میں سماع کا اثر پیدا کیا۔ اور مولانا پر وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ شیخ صلاح الدین مولانا کی حالت دیکھ کر اسی طرح ورق کوٹتے رہے۔ یہاں تک کہ ساری چاندی ضائع ہو گئی۔ اور انہوں نے ہاتھ نہ روکا۔ مولانا نے انہیں آغوش میں لے لیا اور عصر تک رقص کرتے رہے اور شعر گاتے رہے کہ ؎

عجب گنجے پدید آمد ازیں دکانِ زرکوبی
زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہے خوبی

شیخ صلاح الدین نے وہیں کھڑے کھڑے دوکان لٹوا دی اور دامن جھاڑ کر مولانا کے ساتھ ہو گئے۔

مولانا کو شیخ کی صحبت سے بے حد تسلّی ہوئی اور جب شمس تبریز غائب ہو گئے تو انہی کی صحبت ان کے لئے باعثِ تشفّی و تسکین رہی۔

مولانا روم نے عشق کے حسن تصور کو اپنے افکار، اپنے جذبات، اپنے عقیدے، اپنی تعلیم، اپنے مذہب، اپنے مسلک، اپنے کردار اور اپنے عمل کا محور بنایا، وہ جلوِ انسانیت کا ایک ہمہ گیر اور دل پذیر تصوّر ہے۔

رومی کی اصطلاح میں عشق کسی محبوبۂ پری تمثال کی ہوس آمیز محبّت نہیں بلکہ وہ ایک ایسا لافانی جذبہ ہے جو کائنات کے حسن کو اپنی گرفت میں لیتا اور اس خیرِ مطلق سے فروغ حاصل کرتا ہے جو خود خالقِ کائنات کا جمال ہے۔

مولانا روم کی نگاہ میں عاشق صادق وہ ہے جس کا دل گرم، نگاہ پاک اور روح عمل خیر کے لئے سراپا اضطراب ہو۔ وہ نہ صرف اللہ پر بلکہ خود اپنے آپ پر ایمان رکھے کہ وہی اس جہانِ گزراں میں اس کا نائب اور اُس کی مشیتوں کا نگراں ہے۔ تسلیم و رضا اس کا شیوۂ جاں بازی و سرفروشی اس کا شعار اور خدمت خلق اس کی عبادت ہو۔

مولانا کی اپنی زندگی اسی عشقِ صادق کی تفسیر تھی۔ رحم و کرم، جود و سخا، مہر و محبت اور بذل و ایثار ان کی شخصیت کے عناصر اربعہ تھے اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں حق پرستی اور راست بازی کی نعمت عظمٰی اس کثرت سے ارزانی ہوئی تھی کہ وہ حق کی پاسداری میں دنیا کے بڑے سے بڑے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ طبیعت کے انتہائی گداز ہونے کے باوجود شجاعت اور اعتمادِ محبت کا یہ عالم تھا کہ جب ہلاکو خاں کے سپہ سالار بیجو خاں نے قونیہ پر حملہ کیا تو اسے محصور کر لیا۔ محاصرے سے تنگ آکر اہل شہر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ایک بلند ٹیلے پر جو بیجو خاں کے خیمے کے عین سامنے تھا، جاکر مصلّے بچھا دیا۔ اور نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اہل فوج نے معاً تیروں کی بارش کی۔ لیکن مولانا استقلال اور دل جمعی کے ساتھ مصروف عبادت رہے۔ بیجو خاں نے خیمے سے نکل کر کئی تیر چلائے لیکن اسے ایمان کا اعجاز کہئے یا عشق کی کرامات کہ مولانا کو کوئی گزند نہیں پہنچا اور وہ پورے خضوع و خشوع کے ساتھ برابر نماز پڑھتے رہے۔ بیجو خاں کے دل پر اس واقع کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ محاصرہ اٹھا کر چلا گیا۔

مولانا کا کلام اسی گرمئ دل، اسی حرارت عشق، اسی اعتماد ذات اور اسی جذبۂ رضا کا آئینہ دار ہے۔ وہ اس حیاتِ مستعار کو اپنے قلب کی وسعتوں میں سمیٹ لیتے ہیں اور اسے اسی طرح بسر کرتے ہیں اور بسر کرنا سکھاتے ہیں کہ خود زندگی زندہ رہنے والے کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم زندگی سے کیا کیا لیں، بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہم زندگی کو کیا کچھ دیں ؎

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے علاج نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جانِ طور آمد عاشقا
طور مست و خرّ موسیٰ صاعقا

سرِّ پنہاں است اندر زیر و بم
فاش اگر گویم، جہاں برہم زنم

بالبِ دم ساز خود گر جفتمی
ہمچو نے من گفتنیہا گفتمی

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیٔ ہا شکایت می کند

سینہ خواہم شرح شرح از فراق
تا بگویم شرحِ درد اشتیاق
سرِّ من از نالۂ من دور نیست
لیک چشم و گوش را آں نور نیست
بند بگسل باش آزاد اے پسر
چند باشی بند سیم و بند زر
گر بریزی بحر را در کوزۂ
چند گنجد قسمت یک روزۂ
کوزہ چشمِ حریصاں پُر نہ شد
تا صدف قانع نہ شد پُر در نہ شد
ہر کہ را جامہ زعشقے چاک شد
روز حرص و عیب کلی پاک شد

پھر ملّتِ عشق کی ہمہ گیری کو یوں بیان فرمایا ہے ؎

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا
بندہ مارا چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی
ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم
ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم

درحقِ او مدح، درحقِ تو ذم
درحقِ او شہد و درحقِ تو سم

ما بروں را ننگریم و قال را
ما دروں را بنگریم و حال را

موسیا آدابِ داناں دیگر اند
سوختہ جان و مرداناں دیگر اند

ایں گنہ از صد ثواب اولیٰ ترست
خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ ترست

ملّتِ عشق از ہمیں دیں ما جداست
عاشقاں را مذہب و ملّت جداست

وہ انتہا درجے کے عبادت گذار ہوتے ہوئے بھی ان تکلفات کے پابند نہیں۔ جو زاہدانِ خشک کا شیوہ ہیں۔ وہ بندگیِ بے سوز کو عبث اور سجدہ ریزیِ رسمی کو بے کار سمجھتے ہیں۔ عقل و فکر ان کی رہنما۔ لیکن جذب و وجد ان کی غذا ہے۔ وہ محبت اور اطاعت دونوں میں انجذابِ کامل اور استغراقِ بے نہایت کے قائل ہیں۔ اس کے بغیر ان کے نزدیک عبادت بے روح اور اطاعت بے جان ہے، ایک غزل میں ارشاد ہوتا ہے ؎

چو نمازِ شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے
منم و خیالِ یارے غم و نوحہ و فغانے

چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم
در مسجدم بسوزم، چو در رسد اذانے
عجباً نمازِ مستاں، تو مگو درست ہست آں
کہ ندانداوز مانے نہ شناسد او مکانے
عجباً دو رکعت است ایں عجباً چہارم است ایں
عجباً چہ سورہ خواندم چو نداشتم زمانے
در حق چگونہ گویم کہ نہ دستِ ماند و نے دل
دل و دست چوں تو بُردی بدہ اے خدا زبانے
بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

لیکن اس استغراق کے باوصف اور فنا فی الذات ہونے کے باوجود وہ توکل بے جا یا خود فراموشی ناروا کے قائل نہیں لیس للانسان الا ماسعیٰ کی تنبیہہ و نوید ہمیشہ ان کے سامنے ہے اور وہ زندگی کے ہر مقام اور اللہ کی ہر نعمت کو سعیٔ مسلسل اور جہد منواتر حاصل کرنے کا درس دیتے ہیں۔ بندۂ مومن اور عاشق صادق کی یہ شان نہیں کہ وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے۔ بلکہ مقصدِ خیر کے لئے اس کی طلب اور رضائے الٰہی کے لئے اس کی جستجو ہر لحظہ اور ہر آن جاری رہنا چاہیئے۔ یہی شان انسانیت اور یہی اندازِ عبودیت ہے ؎

شیر گفتا آرے ولیکن ہم ببیں   جہد ہائے انبیاد مرسلیں

حق تعالیٰ جہد شاں را راس کرد　　آنچہ دیدند از جفا و گرم سرد
جہد می کن تا توانی اے فتیٰ　　در طریق انبیاء و اولیاء
چیست دنیا از خدا غافل بدن　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن
مال را گر بہر دیں باشی حمول　　نعم مال صالح گفت آں رسول

جہد حق است و دوا حق است و درد
منکر اندر نفیِ جہدش جہد کرد

صدق و صفا، خلوص و محبت، تزکیہ و طہارت اور پھر جہد و عمل کا یہ پیغام چھ صدیوں تک دنیائے اسلام کی وسعتوں اور قلوبِ مومن کی پہنائیوں میں گونجتا رہا۔ صوفیوں نے اسے محورِ حال و قال بنایا، واعظوں نے اس سے گرمیٔ محفل کا کام لیا اور متکلمین نے اسے چراغِ راہ قرار دیا۔ اور جب عقیدت مندوں کی باری آئی تو وہ بے محابا پکار اٹھے کہ ؎

مثنوی مولوی معنوی　　ہست قرآں در زبان پہلوی

لیکن یہ سعادت ساڑھے چھ سو برس کے بعد شاعرِ مشرق اقبال ہی کے حصے میں آئی کہ اس نے رومی کے فکرِ ملک رس اور اس کی سیرتِ باصفا کے امتزاج سے ایک پیکرِ بے مثال تیار کیا، پھر اس کے سوزِ عشق سے اسے حرارت بہم پہنچائی، اسی کے حسنِ نظر سے اُسے جلا بخشی اور اُسی کے نفسِ آتشیں سے اس میں روح پھونکی۔

اسی پیکر کا نام مردِ مومن ہے جس کی فطرت مہرِ نبوت سے مستنیر اور جس کی نگاہ فرمودۂ نقابیہ ہے۔ وہ قلب، گداز جو سوزِ خفی سے پگھل جاتا ہے اور وہ

پنجۂ فولاد جو دستِ قضا سے قوت آزما ہے اسی کے حصے میں آیا ہے اور وہ عاشق جس کے فروغ سے کائنات روشن ہے اور وہ عمل جس کا تسلسل گردشِ ایام پر خندہ زن ہے اسی کو ارزانی ہوا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن
کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

اور مومن کے سرمایۂ حیات یعنی عشق کو رومی نے جس مقام پر چھوڑا تھا۔ اقبالؔ کا تصوّر اسے اس مقام سے بلند تر رفعتوں کی طرف لے اڑا۔ یہاں تک کہ مہ و مشتری اس کی گردِ راہ میں چھپ گئے۔ اقبالؔ کا تصور عشق اگرچہ بلاشبہ رومی سے مستعار ہے لیکن ازبسکہ مرورِ ایام نے گذشتہ سات صدیوں کے دوران میں افراد و اقوام کے ماحول اور ان کے مسائل میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا اور انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیاں یکسر بدل گئیں۔ اس لئے یہ ایک امر فطری تھا کہ اس تابناک تصور کو بھی مزید جلا دی جائے جو مشرق کی روحانی زندگی کا اصلِ اصول ہے۔

چنانچہ اقبال نے عشق کے تصور کو جو فروغ جدید بخشا اس کا امتیازی پہلو وہ فوقیت ہے جو فکر شاعر میں مشرق کی روحانی اور اخلاقی اقدار کو جدید علم وحکمت کی مادی فتوحات پر حاصل ہے اقبال کی شاعری کی وسعتوں میں مادیت اور روحانیت کی یہ پیکار جا بجا نظر آتی ہے اور مادی کامرانیوں کی لاحاصل کی مایوس پکار اس کے سرودِ حیات کے زیروبم میں بار بار سنائی دیتی ہے۔

اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ اقبال کو عشق ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ مومن کو تسخیر عالم کی دعوت دیتا ہے لیکن عقل کی طرح وہ اسے مفاد کا زندانی نہیں بناتا۔ بلکہ وہ اسے عالم کون ومکاں کی آقائی اور دنیوی ماحصل سے بے نیازی کی دولت عطا کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں مغربی علم وحکمت نے جو فتوحات کی ہیں۔ وہ انسانوں کو ایک محدود قوت ضرور مہیا کرتی ہیں، لیکن قدرت کاملہ عطا نہیں کرتیں، وہ اُسے ایک عارضی لطفِ یا فت تو دیتی ہیں، لیکن قدرت کاملہ عطا نہیں کرتیں، وہ اُسے ایک تخیل سے معمور کردیتی ہیں لیکن اس کے قلب کو مسرت سے لبریز نہیں کر پاتیں وہ اسے ادراک کی حدود تک تو لے جاتی ہیں، لیکن ماورائی ادراک کی جھلک نہیں دکھا سکتیں۔

اور یہاں عشق آگے بڑھ کر انسانیتِ درماندہ کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور اسے من وتو اور داد وستد اور جنگ وجدال کے ہنگاموں سے نکال کر کیف وسرور کی ان سرمدی رفعتوں کی طرف لے اڑتا ہے جو ثریا کی ہمدوش اور طوبےٰ کی ہمسایہ ہیں اور جہاں توفیق ربانی انسانیت کی درماندہ روح کو قرار ابد اور

تسکینِ تام عطا کرتی ہے کہ یہی مدعائے زندگی اور یہی اصلِ حیات ہے ؂

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق ہے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اور اس مقامِ رفیع پر پہنچ کر اقبالؔ اپنے مقامِ صعود پر پھر ایک نگاہِ بازپسیں ڈالتا ہے اور دیکھئے کہ اسے وہاں وہی چنگاری روشن نظر آتی ہے جس نے اس کا شعلۂ دل مستعار دیا تھا ؂

صد نالۂ شب گیرے، صد صبح بلا خیزے
صد آہِ شرر ریزے یک شعرِ دلآویزے
در عشق و ہوس ناکی دانی کہ تفاوت چیست
آں تیشۂ فرہادے، ایں حیلۂ پرویزے
ہوشم برد اے مطرب مستم کند اے ساقی
گلبانگ دلاویزے از مرغ سحر خیزے
مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور
تا غوطہ زنم جانم در آتش تبریزے

اقبالؔ اور رومیؔ کا ایک محبوب مشترک

آفتاب

"اور خداوندِ خدا نے فرمایا، روشنی ہو جائے اور روشنی ہو گئی"۔
دنیا کی پہلی کتاب مقدس میں خالق زمین و آسمان کے اوّلین تخلیقی کارنامے کو انہی الفاظ میں یاد کیا گیا ہے اور پھر آخری آسمانی کتاب میں خود رب السّمٰوٰت والارض نے اپنی گراں ترین تخلیق کی یوں عزت افزائی فرمائی ہے کہ "والشمس وضحٰہا" قسم ہے آفتاب کی اور اس کی رخشندگی کی، اور اس کو اپنے پرنورِ ذات سے یوں منسوب و مفتخر فرمایا کہ اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض۔ پھر پیغمبر ایران زرتشت علیہ السّلام نے بھی "تابِ خورشید" الٰہی کو خورشید ہی میں پنہاں دیکھا۔ اور وید مقدس نے اپنے ایک نغمۂ عرفان میں اسی صداقتِ پیدا کا یوں اظہار کیا کہ ؎

اے آفتاب روح روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بند دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجودِ و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیٔ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری
کسے خبر تھی کہ یہ نغمہ جو آج سے صدیوں پہلے رودبارِ ایراوتی کے ساحلوں

بر محل طلوع میں گایا جاتا تھا، چار ہزار برس کے بعد شاعرِ مشرق کے ضمیرِ روشن میں ایک لرزشِ تازہ پیدا کرے گا اور اسی کے طفیل خود ایک حیاتِ جاوداں پا جائے گا۔

واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ط

اقبال کے جن طالب علموں نے اس کا مطالعہ ذرا گہری نظر سے کیا ہے اُن پر یقیناً عیاں ہو گا کہ وہ عنصرِ وحید جو اس کی شاعری کا سب سے اہم اور سب سے رخشاں و نمایاں عنصر رہا ہے۔ اور جو اس کے ارتقائے شعر کے ساتھ ساتھ شروع سے آخر تک نہ صرف اس کا ہم قدم رہا ہے، بلکہ بسا اوقات اُس پر سر بسر چھا گیا ہے۔ عنصر نور و حرارت ہے، جس کا منبع ظاہر تو وہ شاہ کارِ وحدت ہے، جسے ہم آفتاب کہتے ہیں، لیکن سرچشمۂ اولین خود وہ نورِ ازل ہے جو کائنات کے کروڑوں آفتابوں کا مرکز اور بے شمار و بے حساب انوارِ مستعار کا مصدر ہے۔ والشمس وضحٰھا، والقمر اذا تلٰھا، و النھار اذا جلّٰھا، والیل اذا یغشٰھا، والسمآء وما بنٰھا، و الارض وما طحٰھا، ونفس وما سوّٰھا، فالھمھا فجورھا وتقوٰھا، قد افلح من زکّٰھا، وقد خاب من دسّٰھا۔ ط

اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں آفتاب کے پیچھے پیچھے چلنے والے چاند اور اس کی روشنی میں چمک اٹھنے والے دن اور دن کو ڈھانپ لینے والی رات اور آسمان کو تعمیر کرنے اور زمین کو بچھانے والی قوتِ اعلیٰ، ان سب کی مسلسل کارفرمائیوں کا مرکز وہ نفسِ زندہ ہے جسے کمالِ حیات ارزانی کیا گیا اور لاریب وہ انسان کی ذاتِ باشعور ہے کہ اپنے ضمیر کی روشنی میں حق و باطل

کی تمیز کر سکتی ہے۔ چنانچہ اسے اس امر کا اختیار دیا گیا کہ چاہیئے تو اپنے ارتقائے روحانی سے ملائے اعلیٰ کی بلندیوں تک جا پہنچے اور چاہیئے تو مائل بہ تنزل ہو کر ثریٰ کی پستیوں میں اتر جائے۔

یہاں ہمارے لئے ایک مقامِ تامل و تفکر ہے، جہاں سے نورِ ازل کی روشنی میں اس عالم بسیط کی تمام تہ دریاں اور پہنایاں صاف صاف نظر آتی ہیں اور یہ نکتہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات انسان ہی کے لئے خلق کی گئی تھی اور اس کی شب ہائے تیرہ و تار میں آفتابِ حقیقت و صداقت کی جلوہ نمائی کا مقصد ہی یہ تھا کہ زمین و آسمان اس کی تجلّیوں میں اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو پہچانیں اور پہچان کر اپنے معمولات و مقاصد کو نظم و ضبط میں لائیں اور پھر یہ تعارفِ عام ثوابت و سیار اور اجرام زمینی و آسمانی میں سرایت کرتا اور حیات کے بلند پر مظاہر میں سے گزرتا ہوا جب ناظمِ عالم کے اعجازِ بے مثل یعنی انسان تک پہنچے تو اس شعور کی صورت اختیار کر لے جو اسے ایک طرف اپنے سے کمتر مخلوقات یعنی حیوانات اور دوسری جانب اپنے سے برتر موجودات یعنی ملائک سے ممتاز کرتا اور اسی مابہ الامتیاز کو اس کا خاصہ خاص ٹھہراتا اور لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کی تفسیر مجسم پیش کرتا ہے۔ پس یہی وہ سرمایۂ افتخار ہے جو فطرت کی فیاضیوں سے انسان اور صرف انسان کے حصے میں آیا ہے اور انوارِ ربانی سے جلا پا کر ابدالآباد تک اس کے مجدد شرف کا باعث بنا۔

ہائے ذوق کہ اس نکتے کو کیسی سادگی، کیسی خوبی اور کیسے دلآویزی

سے بیان کر گیا ہے ؎

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا، یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اُسی کے جلوے کی روشنی ہے

میری ناچیز رائے کے مطابق ہمارے شعرائے کبیر میں سے جن افرادِ عالی نہاد نے اس حقیقت کبریٰ کا احساس فرمایا اور آفتاب عالمتابِ حقیقت سے خود نور کے ساتھ اپنی والہانہ شیفتگی کے باعث اکتسابِ جلائے باطن کیا، ان میں رومی اور اقبال ایک نہایت بلند اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ دونوں اکابر ارشد تلامذۂ رحمٰن ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ نورِ حق اپنا جلوہ دکھاتا۔ اور اپنے نہاں خانہ ہائے سینہ کو اس کی شعاؤں کی تنویر سے محروم رکھتے۔ جس طرح کوئی طفلِ معصوم چاندنی رات میں اپنی ماں کی گود میں سے ہمکتا اور کششِ ماہ سے مجبور ہو کر چاندنی کی طرف لپکتا ہے، اسی طرح شاعر کا دل بھی آفتاب کے پردے میں اس نور السمٰوٰت والارض کے پرتو سے مجبور ہو کر اس کی طرف بے محابا کھنچتا اور اس حقیقت کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ اپنی ذات کا شعور، اپنے دل کا اجالا اور سرچشمۂ نور میں پروانہ وار گم ہو جانے کی تمنا ہی درحقیقت وہ معراج علم و عرفان ہے جو فطرت بہت کم خوش نصیبوں کو ارزانی کرتی اور بہت کم تلامذہ کی رسائی میں لاتی ہے۔

یہ نکتہ خود حکیم مشرق نے اپنی ایک نظم شیکسپیئر میں کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تاب خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا

چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

عالم کو عریاں دیکھنے کی جس اہلیت کی طرف اشارہ کیا ہے، دراصل یہی اہلیت ہر جویائے حق کی آرزو کا منتہا ہوتی ہے. اور از بسکہ نظارے کے لئے آنکھ کے علاوہ روشنی کا وجود بھی لازم ہے، اس لئے ہر طالب صادق سرچشمہ کی طرف والہانہ پیش قدمی کرتا ہے. اور یہ امر بھی اہل نظر سے مخفی نہیں ہے کہ نظارہ کامل ایک الماس تراشیدہ ہے. کہ نظارۂ ذات، نظارۂ حسن، نظارۂ حق اور نظارۂ صداقت کے چہارگانہ پہلوؤں پر مشتمل ہے پس طالب کی جستجو کا افق جس قدر وسیع اور اس کا معیار جس قدر بلند ہوگا، ذات کے اسرارِ سربستہ، حسن وجمال کے جلوہ ہائے گوناگوں اور حق وصداقت کے لمعاتِ بوقلموں اُسی کثرت اور اسی شدت کے ساتھ اس کے سامنے آئیں گے اور ایک جہانِ معانی اور ایک کائناتِ عرفانی کو بے نقاب کرتے چلے جائیں گے.

اقبالؔ کے ہاں جستجوئے حقیقت اور اس کے منطقی لازمے اکتساب نور کے مراحل ایک دوسرے کا تعاقب کئے چلے جاتے ہیں اور جوں جوں شاعر کی جستجو کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے، اس کا افق عرفان بھی برابر کشادہ ہوتا چلا جاتا ہے. اسی ضمن میں وہ ایک مرحلے پر اپنے دل کو قمر سے تشبیہ دیتے

ہیں اس لئے کہ پرتو نور کی اکتسابی کیفیت میں دونوں ہم نصیب ہیں ؎

یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

اور درد کی کسک یا ترفیع جذباتِ عالیہ کے پرتو نورِ ازلی ہی کا ایک کرشمہ قرار دے کر اقبال نے ہمارے لئے ایوانِ معانی کے چند اور در کھول دیئے ہیں اور علمِ اشیاء، معرفتِ نفس، احساس جمال اور ادراک حقیقت کے خزائن چہارگانہ کے علاوہ فتوحاتِ نور میں ارتفاعِ جذبات کا اضافہ بھی کر دیا ہے اور حق یہ ہے کہ نفسیاتِ انسانی کے حقائق میں یہ ایک نادر و نایاب اضافہ ہے اور یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ مولانائے روم کی شاعری میں بھی یہ عنصرِ نایاب خاصی فراوانی سے موجود ہے ؎

ما ذرہ آفتاب عشقیم	اے عشق برآئی تا برآئیم
مارا بمیانِ ذرہ ہا جو	ما خسرو ترین ذرہ ہائیم
در خانہ چو آفتاب دریافت	گردِ سرِ روزن سرائیم
خامش کہ رہ بلند داری	آخر تو کجاؤ ما کجائیم
شمس تبریز ہمچو خورشید	ما عکس شعاع آں لقائیم

ہم سایۂ آفتاب ذاتم	ہم موج محیط بے کرانم
ہم صورت آفتاب ذاتم	ہم معنیٔ سرّ کن فکانم
چوں شمس کہ پرتو تو دارد	گہہ ظاہرم، گہے نہانم

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

چوں آفتابِ عشق کہ جاں بخش عالم است
بے آفتاب، گنبد دوار راچہ حظ

یہ جس غزل کا شعر ہے، اس کا مطلع ہے کہ ؎

بے روئے یار لالہ و گلزار راچہ حظ
بے ذوقِ عشق لعلِ شکر بار راچہ حظ
چوں آفتاب عشق کہ جاں بخشِ عالم است
بے آفتاب گنبد دوّار راچہ حظ
نورلیست عشق درہمہ اعیاں نمودہ رو
بے نورِ عشق، دیدۂ و دیدار راچہ حظ
برخیز یک صباح کہ چل صبح درگزشت
درخواب رفتہ دیدۂ بیدار راچہ حظ
ازنورِ بے قیاس تجلّی شمسِ دیں
اعمٰی بے بصیرت غدار راچہ خط

پھر ارشاد ہوا کہ ؎

ماہ دربزمِ عشق شُد رقاص — آفتاب ست نورِ رحمتِ خاص
ذرہ شو آفتابِ تاباں را — دائم اندر حریم جاں رقّاص
ہر صباحے بروئے آں خورشید — فاتحہ خواں و سورۂ اخلاص
شمس تبریز غیر راچہ محل — در محیطے کہ عشق شُد خواص

فروغ مہر رخش در درون خانۂ ماست

دُرے کہ مقصد کلیست، در خزانۂ ماست
دُرِ یتیم کہ کونین برنتابیدش
نشستہ در دل دریائے بے کرانۂ ماست

تو نورِ مہر منیری در و شندت چو مہر
کہ ذات عین صفات ست و مہر عین ضیاست
زتنگنائے خودی رخت سوئے صحرا کش
کہ نورِ مہر رخش درخور تو آمد راست

ہوائے یار گرت ہست رو متاب از شمس
بہ آفتاب تواں دیدۂ آفتاب کجاست

اور آخر میں ایک اور شعر نایاب جو اس مختصر مقالے کی تحریکِ نگارش کا باعث ہوا وہ یہ ہے کہ ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ان اشعار تابدار کے یک نظری مطالعے کے ساتھ ذہن معاً دو تین نکات کی طرف منتقل ہوتا ہے پہلا یہ کہ رومی کے ہاں چہرۂ محبوب، ماہ نہیں، مہر ہے چاند نہیں بلکہ سورج ہے اور اس تصور میں زندگی کی وہ تمام کیفیاتِ حرارت وحدت موجود ہیں جو آفتاب سے خاص ہیں۔ دوسرا یہ کہ انسان ذاتِ باری سے وہی نسبت و تعلق رکھتا ہے، جو ذرّے کو

آفتاب کے ساتھ ہے اور تیسرا یہ کہ عشق براہِ راست اس سرچشمۂ نور و حرارت سے مستنیر ہے جس نے خود آفتاب کو حرارت بخشی اور اسے زندگی کا خالق و رہنما بنایا اور چوتھا یہ کہ رومی کے ہاں رات موت کی اور روزِ روشن صحیح طور پر زندگی کی علامت اور اس کے ہم معنی ہے اور یہی وہ خاص نقطۂ اتصال ہے جہاں ہمیں رومی اور اقبال دست بدست اور شانہ بشانہ اور سینہ بہ سینہ نظر آتے ہیں۔

اگر وقت ہوتا تو اس نقطے کی وضاحت کے لئے آپ کے سامنے بے شمار مثالیں رکھتا، لیکن اب صرف چند اشعار نذر کرنے کے بعد آپ سے رخصت چاہوں گا۔

جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں، اقبال کے ہاں اس کے دوسرے تصورات کی طرح تصورِ آفتاب میں بھی ایک تدریجی کیفیت ہے۔ گائتری کا ترجمہ (جو درحقیقت ترجمہ نہیں، بلکہ ایک سراسر نیا لباسِ سخن ہے آپ ملاحظہ فرما چکے، اب آمدِ سحر کا ایک منظر دیکھئے کہ اقبال کے ابتدائی دورِ سخن سے تعلق رکھتا ہے۔ سحر کہ جسے شاعر نے ایک جگہ دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار بھی کہا ہے، ردائے شب اٹھا کر یوں جلوہ افروز ہوتی ہے ؎

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغِ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہم کنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

یہ اشعار اقبالؔ کی ایک طویل نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" سے لئے گئے ہیں۔ اس عالمِ ہست و بود کی مختلف منازل میں سے موت کا مقام ہی ایک ایسا مقام ہے، جہاں پہنچ کر انسان بالکل بے بس و مجبور ہو جاتا ہے اور موت کا پنجۂ آہنی، اس کے ارادوں اور عزائم، اس کی تمناؤں اور امیدوں اور اس کے حوصلہ و وقار کو اپنی گرفت میں لے کر چکنا چور کر دیتا ہے لیکن دیکھئے کہ اس مقام پر پہنچ کر بھی شاعرِ مشرق اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا اور اپنی ماں کے مرقد پر بھی سرنگوں نہیں ہوتا۔ بلکہ افقِ خاور کی طرف دیکھتا ہے اور زندگی کی ایک نئی صبح اور آفتاب کے ایک نئے جلوے کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اور خود زندگی کو نمود و درخشانی کا پیغامِ جاوداں دیتا ہے۔ اکتاب و انتشارِ نور اور تحریک و توسیعِ زندگی کی اس سے خوب تر مثال دنیا کی ادبیاتِ عالیہ میں شاید ہی کہیں مل سکے ؎

دلیلِ صبحِ روشن ہے، ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوارا تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی
تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

آپ نے محسوس فرمایا ہوگا کہ اِن دو مختصر نمونوں میں تین جگہ گلِ لالہ کا ذکر آیا ہے۔ گلِ لالہ کا یہ ذکر اقبالؔ کے ہاں ایک امرِ فطری تھا۔ کیونکہ اس کے علائم و نشانات میں ہر وہ چیز موجود ہے جو آفتاب یا خصوصیت آفتاب سے نسبت رکھتی ہے۔ لالہ کو آتش سے اور آتش کو خورشید سے جو نسبت خاص ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اقبالؔ کا شاہین بھی اس کی آفتاب دوستی ہی کی ایک علامت ہے، وہ اپنا بسیرا اونچی اونچی چٹانوں پر کر کے آفتاب کا حقِ ہمسائگی ادا کرتا اور حقِ ہمسائگی ہی ادا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اور اسی کا رخ کر کے اپنے پرِ پروازِ دوشِ ہوا پر کھول دیتا ہے۔ گلِ لالہ ہم رنگِ شفق ہے اور اپنے رنگ میں اُبھرتے ہوئے آفتاب ہی کی عکاسی کرتا ہے اور شاید اسی نسبتِ آفتابی سے اقبالؔ نے اپنے مرشد مولائے روم کی نسبت بھی کچھ ایسا ہی کہا تھا کہ ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

اور اب چلتے چلتے نوید صبح کے چند اشعار سنتے جائیے جو اقبال نے ہنگامہ جنگِ طرابلس کے خاتمے اور جنگِ بلقان کے آغاز میں لکھی تھی اور مشرق میں ایک نئی صبح کی نوید سے مسلم خوابیدہ کو اذنِ بیداری دیا تھا؎

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزلِ ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر

محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات

مسلمِ خوابیدہ اٹھ، ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر گرمِ تقاضا تو بھی ہو

وسعتِ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغِ سحاب

کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرمِ ستیز
پھر سکھا تاریکیِ باطل کو آدابِ گریز

تو سراپا نور ہے خوشتر ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے

ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

اور اب میرے اور وقت کے دامانِ تنگ میں گل ہائے حسن سخن کی مزید گنجائش نہیں لیکن آفتاب کی بیٹی یعنی شعاعِ آفتاب میرا دامن کھینچ رہی ہے کہ مجھے کیوں بھولے جاتے ہو، پس اگر آپ اجازت دیں تو کچھ وہ باتیں بھی سن لیں، جو شاعرِ مشرق نے اس دوشیزہ سے کی تھیں ؎

صبح جب میری نگہ سودائی نظّارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی

میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب

تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں

یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے، کیا ہے یہ
رقص ہے، آوارگی ہے، جستجو ہے، کیا ہے یہ

کرن جواب دیتی ہے ؎

خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستیٔ خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں

مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذّتِ تنویر رکھتی ہے مجھے

برق آتش خو نہیں، فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالمتاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں
سرمہ بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤں گی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا ہے دکھلاؤں گی میں
تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے
سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے

اور یہ کیسی خوش اتفاقی ہے کہ اس کرن کے چیلنج کو مرشدِ اقبالؒ صدیوں پہلے یہ کہہ کر قبول فرما گئے تھے کہ ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چوں غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ رومیؒ کے محبوب و مرشد کا نام شمس اور اقبالؒ کے فرزند اکبر کا نام "آفتاب" ہے۔

دانائے راز

اسلامیانِ ہند کی قومی اور سیاسی انحطاط کی رو، جو اٹھارویں صدی کے آغاز میں اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد حرکت میں آئی تھی۔ پورے ڈیڑھ سو برس تک مسلسل جاری رہی۔ تا آنکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد، وہ اپنی آخری منزل تک جا پہنچی ہے۔ ستاون کا ہنگامہ ظلمت کدۂ ہند میں اس شمعِ محفل افروز کا آخری سنبھالا تھا جسے پہلے پہل سندھ کے ساحل پر محمد بن قاسم کے نورِ ایمان نے روشن کیا تھا۔ اس شمع کے بجھ جانے پر چاروں طرف اندھیرا ہی چھا گیا۔ سوات اور بنیر کے کہستانوں میں کچھ چنگاریاں دم بھر کے لئے فروزاں ہوئیں لیکن ہوائے مغرب کے تیز و تند جھونکوں نے انہیں بہت جلد افسردہ کر دیا۔

اتنے میں ایک کونے سے روشنی کے کچھ کچھ آثار پیدا ہوئے، غور سے

دیکھا تو ایک مردِ معمر انگریزی وضع کی لالٹین لئے راستہ ٹٹولتا اور اپنے ہمراہیوں کو راہ دکھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے در و دیوار کے آثار واضح ہونے لگے۔ لالٹین جگمگانے لگی اور پیر مرد کے ساتھیوں کے چہرے پھر سے کھل اٹھے زندگی نئی امیدوں اور نئے وعدوں کے ساتھ انہیں پھر سے اپنی طرف بلا رہی تھی، آپ اس مردِ بزرگ کو پہچان گئے ہوں گے۔ یہ سر سید احمد صاحب تھے۔ جنہیں وقت کا اصرار اور تاریخ کا تقاضا ایک بھٹکی ہوئی قوم کی رہبری کے لئے کشاں کشاں جادۂ حیات پہ لے آیا تھا۔ سر سیّد نے قوم کو جو منصوبۂ عمل دیا اس نے زوال کی ڈھلوان پہ پھسلتی ہوئی قوم کے قدموں کو فوراً استقامت بخشی اور اس کا رخ یکسر بدل کر زندگی کی ایک نئی منزل اور کامیابی کے ایک نئے تصوّر کی طرف پھیر دیا۔

سر سیّد نے ہمیں قومی تعمیر کے اس جدید تصوّر سے آشنا کر کے درحقیقت اپنا مشن پورا کر دیا تھا۔ پھر وہ چلتے چلتے ہمیں وہ ڈھانچہ بھی دے گئے جو اس تصوّر کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، اور جسے بعد میں اُن کے تابعین، خصوصاً حالیؔ نے سنگ و خشت سے پائندہ اور رنگ و روغن سے آراستہ کیا۔ حالیؔ نے اپنے مخصوص دھیمے اور منطقی انداز میں ہمیں اپنی دنیوی بدحالی کی طرف متوجہ کیا۔ ہمارے عروج و زوال کے اسباب کا ایک حقیقت پرستانہ تجزیہ کیا اور پھر ہمیں اسی منصوبے کی حدود میں پابند کر کے ہمارے لئے دنیوی فلاح کا وہی علاج تجویز کیا جس کا نسخہ سر سیّد نے بنایا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی مقتضیات غالباً تھیں بھی اسی قدر، ہم زندگی کا

ایک نیا اسلوب اختیار کر رہے تھے۔ دنیوی زندگی میں ہمارے برادرانِ وطن ہم سے گوئے سبقت لئے جا رہے تھے۔ اطرافِ عالم میں وہ امن قائم تھا جو بنیادی کام کرنے والوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لازم تھا کہ ہم اپنی ساری توجہ اپنی اساسی تعمیر پر مرکوز رکھیں۔ اور اوپر آنکھیں اٹھانے سے پہلے، زمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیں۔

ہمارے اکابر میں غالباً شبلی نے سب سے پہلے اُس جمود کو محسوس کیا جو سر سید کے تعمیری منصوبے کا ردِ عمل تھا اور جو ہماری قومی زندگی کے روحانی اور جذباتی پہلو پر چھا رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبالؔ، عبدالقادر اور محمد علی جوہر جیسے نوجوان جنہیں سر سیدؔ تحریک کے آغاز اولین کہیے، یورپ میں اپنی تعلیم و تربیت مکمل کر کے واپس آ چکے تھے یا آ رہے تھے۔ ادھر طرابلس اور بلقان میں یورپ اور اسلام کی ایک نئی آویزش شروع ہو گئی تھی۔ اور ادھر ہندوستان میں انگریز کی سیاست نے مسلمانوں سے ایک نئی ٹکر لے لی تھی۔ ایسے میں اسلامیانِ ہند کے احساس نے ایک نئی کروٹ لی اور وہ پہلی مرتبہ اُس شعور سے آشنا ہوئے جسے ایک عالمگیر اسلامی قومیت اور اخوت کے تصور نے جنم دیا تھا، یہ تصورؔ اس قومیت کے تصوّر سے بالکل جدا تھا جسے ہندوستانی نیشنلزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے اُن دنوں تلک کی عصبیت اور گوکھلے کی آل اندلیشی پروان چڑھا رہی تھی۔ مسلمانانِ ہند کا یہ احساسِ قومیت بھی وقت کا ایک تقاضا تھا۔ اور زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اُسے ایک بڑی حد تک مغربی تعلیم ہی نے پیدا کیا تھا۔ اس میں کوئی کلام

نہیں کہ مسلمان ترقی کی دوڑ میں اپنے ہم وطنوں سے ابھی بہت پیچھے تھے۔ اور اُن کا درمیانی طبقہ ابھی اپنے مسائل معاش میں بڑی شدت سے مبتلا تھا لیکن جو تھوڑی بہت بیداری ان میں نظر آرہی تھی وہ کم و بیش انھی لوگوں کی مرہونِ منت تھی، جو یا تو خود اعلیٰ مغربی تعلیم سے مستفید ہوئے تھے، یا جنہوں نے بالواسطہ اس کے اثرات قبول کئے تھے۔ پہلے طبقہ میں اقبال ظفر علی خاں، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، محمد علی جناح، مظہر الحق، سیف الدین کچلو اور مختار احمد انصاری۔ اور دوسرے میں شبلی، اکبر الہ آبادی اجمل خاں اور ابو الکلام آزاد کے نام آسانی سے لئے جا سکتے ہیں۔

محمد علی ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں یورپ سے واپس آنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد میدانِ سیاست میں بے محابا کود پڑے اور جنگ بلقان کے دوران میں اپنا مشہور مقالہ (COME TOMEDINA ANDHELPUS) لکھ کر عتابِ فرنگ کا شکار ہو گئے۔ ظفر علی خاں اور حسرت موہانی بھی اسی راستے پر گامزن ہو کر اپنی منزلِ مقصود کو پہنچے۔ کم و بیش یہی انداز مسلمانوں کے دیگر اکابر نے اختیار کیا اور شبلی کے سوا جو اپنی ہنگامہ خیز نظم ؎

حکومت پہ زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

پر قید ہوتے ہوتے بچ گئے۔ اور پھر بہت جلد سفرِ آخرت اختیار کر گئے، باقی سب نے تحریک میں عملی حصہ لیا اور ان تمام نتائج سے دوچار ہوئے جو اس جرأت آموز اقدام سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان سب کے خلاف اقبال اس سارے عرصے میں ہنگاموں سے دور اپنے کلبۂ دانش میں الگ تھلگ بیٹھے، اس فکر کے فراغ وارتقا پر اپنی ساری توجہ صرف کرتے رہے، جو ایک دن ہندوستان میں امت مسلمہ کی رہنمائی کرنے والا تھا۔ میری ناچیز رائے میں اُن کے فکرِ بلیغ کے معرکہ آرا عروج کا راز اُن کی اِسی خلوت نشینی اور عافیت پسندی میں پنہاں تھا۔ وہ ایک ناظر کی حیثیت سے، جو خود شریکِ دغا نہیں ہوتا۔ لیکن ایک بلند ٹیلے پر بیٹھا سارے کارزار کا نقشہ دیکھتا رہتا ہے، ہمارے کارزارِ حیات کا ناقد نظر سے مطالعہ کرتے۔ اور ہمیں اپنے ارتقا سے فکر کی ہر منزل پر اس سے مستفید ہونے کا موقع دیتے رہے۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک وہ وطن پرستی کی باغ وبہار وادی کو طے کر کے احیائے ملّت کے پائیدہ تر تصور کو قالبِ شعر میں ڈھال چکے تھے۔ ان کی حرارت آفریں نظم فاطمہ بنت عبداللہ اور وہ غزل جس کا مطلع ہے کہ ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا!
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز پھر آشکار ہوگا

اور بیت الغزل یہ ہے کہ ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے قدسیوں سے میں نے یہ راز پھر آشکار ہوگا

دلوں میں آگ لگا چکی تھی۔ شکوہ اور جواب شکوہ، خیر الامم کی زبوں حالی اور اس کے علاج کی تدبیروں کو سامنے لا چکے تھے، اور شمع وشاعر

مردِ مومن کے سینۂ گرم اور قلبِ مضطر کا جائزہ لے کر اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔
جنگِ عظیم کا وقفہ اقبالؔ کی قومی شاعری کے لئے سکون اور فرد کی ممکنات پر اُس کے بلوغِ فکر کا زمانہ تھا۔ وہ بظاہر خاموش تھا لیکن اُس کے نہاں خانۂ قلب میں انسانِ عظیم تر نے خودی کی وہ قندیل روشن کر کے رکھ دی تھی۔ جس کی روشنی میں آنے والے اٹھارہ سال میں اُس کے سینے سے چھن چھن کر ہمارے در و دیوار کو منوّر کرتی رہی۔ اس میں کلام نہیں کہ اقبالؔ بظاہر فرد کو محض اس موج کی حیثیت دیتا ہے جو ؎

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

لیکن مقامِ حیرت ہے کہ اس نے قوم کی تعمیر کی بنیاد سراسر فرد کی تعمیر پر رکھی ہے یہاں اس پر بحث کرنا شاید موزوں نہ ہو کہ نطشے کے SUPER MAN اور اقبالؔ کے مردِ خود آگاہ کے ربطِ باہم کی کیا کیفیت ہے، یا خودی کا تصور اس جذبۂ مسابقت نے تو پیدا نہیں کیا جو انگریز کے مٹتے ہوئے اقتدار اور ہندو کی بڑھتی ہوئی یلغار کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ اقبالؔ فرد ہی کو ان بلند ترین صلاحیتوں کا اہل سمجھتا تھا، جو فطرت کے احاطۂ امکان میں ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ اسے عظیم المرتبت افراد کی ایک پوری قوم تیار کر کے اپنے ایک سنہری خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا آرزومند رہا اور کیا عجب ہے کہ اس کا یہ خواب سچ مچ شرمندہ تعبیر ہو جائے۔

اقبالؔ کے ارتقائے فکر میں مردِ خود آگاہ سے اگلا قدم مردِ مومن ہے۔

جس کا دل تپشِ شوق سے گرم اور جس کا سینہ پرتوِ عشق سے فروزاں رہتا ہے اقبالؔ نے بعض الفاظ کو جو نئے معانی عطا کئے ہیں ان کی رو سے عشق ان تمام اقدارِ اعلیٰ کا حامل ہے جو انسانیت کو الوہیت سے قریب تر لاتی ہیں۔ اقبالؔ علم اشیاء کی افادیت کے منکر نہیں۔ وہ دنیا اور اس کی نعمتوں کو مردِ مومن کی میراث سمجھتا ہے لیکن وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی مادی فتوحات میں گم ہو کر رہ جائے اور اس رشتۂ بے نام کو ہاتھ سے چھوڑ دے جو اسے کائنات کی اعلیٰ قدروں سے وابستہ کرتا اور ضمیرِ کائنات کا ہمنوا کرتا ہے۔ اقبالؔ نے مغربی فلسفے، مغربی سائنس، مغربی دولت اور مغربی قوت کا عروج جی بھر کے دیکھا ہے اور اس عروج میں اس کے زوالِ ناگزیر کو بھی جھانکتا پایا ہے پھر کیا سبب ہے کہ وہ اپنے مقصود نظر انسان کو اس خطرے سے آگاہ نہ کرے جو مغرب کی عالمگیر سیاست اور آسمان پرواز حکمت میں مضمر ہے یہ سچ ہے کہ وہ ہمیں رہبانیت کی طرف نہیں لاتا، بلکہ اس سے متنفر کرتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وہ تسخیرِ عالم کو مومن کا پہلا فریضہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی چند قدریں باقی رہ جاتی ہیں۔ اور وہی زندگی کی اعلیٰ اور صحیح قدریں ہیں ؎

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جہاں سرسیّد نے ہماری قومی فلاح و بہبود کا راز اسی میں سمجھا کہ ہم مغربی تعلیم حاصل کر کے دنیا کی متمدن

قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہو جائیں۔ اور حالی ہمیں اپنی پستی اور غفلت کا احساس دلا کر اُن ذاتی عادات اور قومی کیفیات سے متنفر کرنے کی کوشش کی جن میں ایک زوال پذیر مشرقیت نے ہمیں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہاں اقبال نے اِن مادی مظاہر کی طرف چنداں اعتنا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنی ساری توجہ فرد کی سیرت کے ارتقا پر مرکوز کر دی ـــ وہ جانتا تھا کہ زود یا بدیر ہمارا معاشرہ مغربی سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ اور ان بیشتر خصوصیات سے مملو ہو جائے گا جو تقلیدِ مغرب سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟ مغربی تہذیب کی بڑی سے بڑی کامیابی بھی انسان کو اس منزل پر نہیں پہنچا سکتی جسے قرآنِ حکیم کے الفاظ میں فوزِ عظیم کہا گیا ہے۔ یہیں وہ فرد کو اس کی دنیوی کامیابیوں کے عین عروج میں اس روح کامرانی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جو بشرِ کامل کے شایانِ شان ہے۔ اور جو در اصل فرد اور قوم دونوں کا سرمایۂ حیات ہے۔ اقبال کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ تہذیب مغرب آج ہمیں بہتر زندگی کی ایک منزل تک ضرور لے جاتی ہے لیکن وہ اس سے بھی بدرجہ اولیٰ آگاہ تھا کہ انسانیت عظمیٰ کا مقام اس سے بہت آگے ہے اور اس نے اپنی قوم کے ہر ذی حس اور بالغ نظر فرد کو اس زاویۂ نظر تک لے آنے کی ایک سعی بلیغ کی۔ جہاں سے وہ جہانِ مرغ و ماہی اور جہانِ ماہ و مشتری دونوں کا نظارہ کر کے اپنی منزل کا تعین کر سکتا ہے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس نغمے پیغام کی روح قبول کی اور

انسانیت کے اس مقام سے آگاہ ہوئے جو بہیمیت کے تصور اور ملوکیت کے تقدس دونوں پر خندہ زن ہے۔

اور ذرا غور کیجئے کہ مغرب کی حیات آفریں کش مکش اور مشرق کی روح افروز طمانیت کا امتزاج ہمیں اس مردِ حق آگاہ کے سوا کون دے سکتا تھا۔ جو اس دنیا کے ہنگاموں میں رہ کر بھی ان سے بلند رہا۔ اور جب تک جیا خمِ فرنگ میں مئے حجاز بھر بھر کے پیتا اور پلاتا رہا اور اب کسے خبر ہے کہ ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید ؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید ؟

اقبالؔ کے دس شعر

کلامِ اقبالؔ سے لطف و سرور کا حصول اور علم و حکمت کا اکتساب ایامِ جوانی ہی سے اس فقیر کا وظیفۂ زندگی رہا ہے اور امید ہے کہ دمِ آخر تک یوں ہی باقی و برقرار رہے گا۔ کوئی چالیس بیالیس برس کی بات ہے میں اور میرے عزیز ترین دوست منصور احمد مرحوم ہر شام کنارِ راوی تک جاتے اور راستہ بھر کلامِ اقبالؔ ہی موضوعِ سخن رہتا۔ انہی دنوں سوءِ اتفاق سے ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان نے خودکشی کر لی۔ اس شام میں نے منصور مرحوم سے کہا کہ کاش پریم پرکاش، اقبالؔ اور گفتۂ اقبال سے آشنا ہوتا، پھر وہ خودکشی کبھی نہ کرتا۔ آپ جانتے ہیں، مرحوم نے اس کا کیا جواب دیا؟ کہنے لگے کہ میں اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ جن لاکھوں لوگوں کی زندگانی میں شعرِ اقبالؔ کو دخل نہیں ہے، وہ زندہ کیوں ہیں، اور خودکشی

کیوں نہیں کر لیتے ؟

اور یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی اقبال کا وہی کلام روشناسِ خلق ہوا تھا جس کا بیشتر حصّہ بانگ درا اور اسرار و رموز کی زینت ہے۔ پیامِ مشرق اور بال جبریل اور ضرب کلیم اور شاعر کے دیگر مجموعوں کے نوادر نے ابھی چشمِ عالم کو خیرہ نہیں کیا تھا۔ پھر مشرق کے آسمان پر بصیرت و حکمت کا وہ آفتاب طلوع ہوا جس کی ضیا پاشیوں میں عالمِ انسانیت نے بالعموم اور ملّتِ اسلامیہ نے بالخصوص فلاح و فوز کی راہیں تلاش کیں اور توفیق الٰہی کے سہارے اُن پر قدم اٹھائے اور آج اگرچہ ملّت کے ایوانوں میں وہ فضائیں سرد پڑ چکی ہیں، جنہیں شاعرِ مشرق کے نفسِ آتشیں نے ایک حرارتِ تازہ و نایاب عطا کی تھی۔ لیکن ازبسکہ روح کو دوام ہے، اس لئے ہم ہرگز اس امکان سے مایوس اور اس امید سے محروم نہیں ہیں کہ اقبال کی ندائے سرمدی ایک بار پھر دلوں کو گرمائے گی اور قوم کو پھر وہ بھولا ہوا سبق یاد دلائے گی جو اس سرزمینِ خداداد پر خلافتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دیتا اور بحالی عدل و خیر کی طرف پکارتا ہے۔

یہ چند الفاظ جو ان اوراق میں آپ کے پیشِ نظر ہیں، روحِ سخنِ اقبال کے اظہار کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی حیثیت رکھتے ہیں، جو محض ایک اتّفاق سے معرضِ وجود و نمود میں آ کر اپنی ناکامیوں میں تمام ہوئی۔ گزشتہ محرّم الحرام کے آغاز سے کچھ روز پہلے مجھ سے نشرگاہِ لاہور نے فرمائش کی کہ عشرۂ مبارک کے ایّام میں ہر شام حضرتِ علّامہ کے فقط ایک شعر کی مختصر سی تشریح، جو

پانچ منٹ میں تمام ہو جائے، اس کے سامعین کی خدمت میں پیش کروں۔
اس ارشاد کی تعمیل میں جو دس اشعار میں نے محض ارتجالاً چنے اور ان کی جو
ناقص توضیحات پیش کیں وہ آج آپ کے سامنے ہیں۔ اگر محبّ گرامی چودھری
بشیر احمد صاحب ایم اے اس کی تائید نہ فرماتے اور مرکزی دفتر نشریات
اشاعت کی اجازت مرحمت نہ فرماتا تو ان اشعار کی تفسیر کا یہ مجموعۂ حقیر
ترتیب و تشکیل نہ پاتا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں اور ذاتِ ایزدی سے امید
رکھتا ہوں کہ اس پیش کش کی وجہ سے میں روحِ اقبال سے کسی طور شرمسار
نہیں ہوں گا۔

(۱)

صحبتِ پیرِ رومؔ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب، ایک کلیمؑ سربکف

صبحِ تاریخ سے لے کر آج کے دن تک تقدیرِ انسانی جن عظیم عناصر کے تابع رہی ہے اور جن حیرت ناک قوتوں نے انسان کو اس کے موجودہ عروج تک پہنچایا ہے، غور کیجئے تو وہ فقط تین عناصر اور تین ہی قوتیں ہیں، علم و حکمت، جذب و عشق اور جہد و عمل، انسان کے ارتقار کی تاریخ درحقیقت انہی عناصرِ عظیم کی تاریخ ہے اور دنیا کی کوئی قوم اور نسلِ انسانی کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کی رہبری، نجات اور کامرانی میں ان عناصرِ سہ گانہ کی بیش و کم کارفرمائی شامل نہ رہی ہو۔

حضرتِ علامہ کی نگاہوں کے سامنے تاریخِ انسانی کے جو اوراق روشن تھے اور جن کی روشنی تاریخ کے صفحات سے نکل نکل کر امتِ مرحومہ کے احوالِ حاضرہ پر پڑ رہی تھی، ان کے نقوش میں سب سے تابناک

نقشِ عمل کا نقش تھا کہ یہی اُن قوموں کے لئے ایک طلسم کامل کا حکم رکھتا ہے، جو غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو کر پس چکی ہوں، جن پر جبر و استبداد کی لائی ہوئی ذلتیں اور نکبتیں تمام ہو چکی ہوں اور جن پر فراز کے سب راستے بند اور نجات کی سب راہیں مسدود ہو گئی ہوں۔ بنی اسرائیل کی قوم ایک ایسی ہی قوم تھی۔ وہ اپنے دورِ عروج میں ثریا کی رفعتوں کو چھو چکی تھی لیکن جب وہ گری تو اسے تحت الثریٰ میں بھی جگہ نہ ملی۔ اس صورتِ حال میں فطرتِ الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی نجات اور حیاتِ تازہ کے لئے ایک ایسے نبی کو مبعوث کیا جائے جو سراپا جہد و عمل ہو اور جو اپنی باطل شکن قوت سے ظلم و استبداد کی طاقتوں کو شکست دے اور اللہ کی سرزمین پر از سرِ نو اُس کی بادشاہت قائم کرے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لا تخف کے پیام حیات افروز سے نوازا گیا۔ اور غیر اللہ کا خوف اُن کے دل سے اس طرح نکال دیا گیا جیسے وہاں کبھی اس کا سایہ تک نہیں پڑا تھا اور پھر جہد و عمل کا یہ پیکرِ عظیم کامل چالیس برس تک فرعون کی قہرمانیوں کا عین اُس کے قلبِ سلطنت میں بیٹھ کر مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا عزم اور عمل طاغوتی طاقتوں پر غالب آیا اور اس کی قوم کی نجاتِ کاملہ کا باعث بنا۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام کی داستانِ عمل یہیں تمام نہیں ہو جاتی۔ بیرونی دشمنوں کو زیر کرنے کے بعد انہیں خود اپنی قوم کے باغی اور مفسد عناصر سے سابقہ پڑا۔ اور ان عناصر کی گمراہیوں اور مفسدہ پردازیوں کا

مقابلہ کرنے میں ان کے ایام پیری کا بیشتر حصّہ صرف ہوا لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ ایک فائز المرام قوم کے ہادیٔ برحق تھے۔ ان کی مجاہدانہ زندگی فوزِ کبیر حاصل کر چکی تھی۔ اور وہ خود انسانیت عظمیٰ کے لئے صلابت کردار، عزیمت و ہمت اور حق پرستی و صداقت پروری کی ایک عجیب و غریب مثال قائم کر چکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم و حکمت شرفِ انسانی کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ علم و حکمت سے جو حیات آفریں نتائج مرتب ہوتے ہیں، وہ جذب و شوق اور عشق و وارفتگی کے بغیر حرکت میں نہیں آتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حکمت اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ عشق کا سیلِ رواں ایک تموج ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جب تک وہ ایثار و عمل کی رود باروں میں داخل نہیں ہوتا، مزرعۂ ہستی کی سیرابی کی کوئی صورت معرضِ نمود و وجود میں نہیں آتی اور یہی وہ نکتہ ہے، جو ایثار و عمل کو تہذیب انسانی کے ارتقار اور شرفِ آدم کے عروج میں اوّلین مقام دلاتا ہے اور یہی وہ راز ہے جس سے آشنا ہو کر حکیم الامّت نے امّتِ مرحومہ کے موجودہ دورِ نکبت کا بھید پالیا تھا اور پھر مرشدِ رومی کا ہم نوا ہو کر اسی کو اپنی قوم کے نام اپنے پیغام پیکر عطا فرمایا تھا۔ لاریب اقبالؔ کا پیغام محض عمل کا پیغام ہے، ایک ایسے عمل کا، جو حکمت کی احتیاطوں اور دانش کے اندازوں کو روندتا ہوا، عشق کے جذب و شوق سے سرشار ہو کر عرصۂ ہستی میں دیوانہ وار کود پڑتا اور محال کو آسان اور ناممکن کو ممکن بنا دیتا

ہے۔ آج ہمیں اپنی منازلِ دشوار کو طے کرنے اور اپنے مسائلِ مصیبت افزا کو حل کرنے کے لئے ایثار و عمل کے اسی جذبۂ عالی اور اسی شوقِ بے پروا کی ضرورت ہے۔ حکمت کے ناخن زمانے کی گتھیاں سلجھاتے رہیں گے، ضربِ کلیم کیوں کسی کا انتظار کرے ؎

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب' ایک کلیم سر بکف۔

---

(۲)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق

خداوندِ ارض و سما نے جب آدم کو اپنی خلافت کا شرف بخشا تو مقصود اس سے یہ تھا کہ آدم اُن تمام اُلوہی صفات کا وارث بھی بنے۔ جو ذاتِ کبریا سے خاص ہیں۔ اور اُنہی سے آراستہ ہو کر اس عالمِ کون و مکان کی تنظیم و تہذیب بھی کرے۔ —— خلافتِ الٰہیہ اسی مقصود کا دوسرا نام ہے۔

لیکن مقامِ حیرت و افسوس ہے کہ آدم ہی کی نسل سے ایسے بہت سے انسان پیدا ہوئے جو اس مقام سے بے خبر ہو گئے جس پر افضالِ الٰہی نے انہیں فائز کیا تھا۔ شاعرِ مشرق کی اصطلاح میں انہی افراد و اقوام پر کفر کا اطلاق ہوتا ہے، کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ اپنے آپ کو پہچانا،

نہ اپنی ممکنات کو تسلیم کیا اور نہ اُس منصب عالی ہی کی پروا کی جسے فطرتِ الٰہیہ نے ان کے لئے تجویز فرمایا تھا۔ چنانچہ آفاق کی حدود کو اُن کا قید خانہ قرار دیا گیا اور حیاتِ دنیوی کے وہ مقامات جو انسان کے ایوانِ خلافت کے سنگہائے آستاں کا درجہ رکھتے تھے۔ اُن کی جبینوں کی سجدہ گہہ بن گئے اور وہ اسباب و متاعِ حیات جو اُس کی ٹھوکروں کے انتظار میں تھے، اُن کے معبود قرار پائے۔ ناشکری، کوتاہ نظری اور ناشناسی کی یہ کیفیت اقبالؔ کی اصطلاح میں کفر کہلاتی ہے۔ اور جو اقوام و افراد اس میں مبتلا ہیں، یا ہو رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ ادنیٰ علائقِ دنیا کی بھول بھلیوں میں بھٹک بھٹک کر اُس انجام کو پہنچے ہیں جو منشائے ربانی اور تقاضائے انسانیت دونوں کے خلاف تھا۔

ان کے مقابل جن افراد و اقوام نے اپنے رتبے اور مقام کو پہچانا اور بندگانِ مولا صفات بن کر اُن اعلیٰ تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جو اِس زمین پر خداوند لایزال کی خلافت سے خاص تھے، اُن کی نگاہیں فطرت کے سراپردے کو چیرتی ہوئی عرش تک جا پہنچیں، اُن کے عمل کی حدود کائنات کی غیر محدود وسعتوں میں تحلیل ہو گئیں اور دنیا اُن کے قدموں کے تلے محض ایک عرصۂ تگ و تاز بن کر رہ گئی۔ یہی وہ صالحین تھے اور ہیں، جو خداوندِ جل و علیٰ اور اس کے منشا پر اور خود اپنے آپ اور اپنی ممکنات پر ایک ایمان غیر متزلزل رکھتے ہیں اور ان توقعات کو پورا کرتے ہیں جو خالقِ کائنات نے اپنی خلافت کے سپرد کرتے وقت ان سے

وابستہ کی تھیں۔

اقبالؔ کی زبان میں مومن کی اصطلاحِ لطیف و شریف انہی پر راست آتی اور انہی سے ایک معنیٰ نایاب حاصل کرتی ہے۔ سادہ تر زبان میں شاعر کا منشا یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اسبابِ دنیوی کو اپنا معبود بنایا اور اپنے آپ کو اُن ظاہری حدود میں مقید کر دیا جو انہیں اپنے ارد گرد نظر آتی ہیں اور خلقتِ انسانی کے منشا کو پورا کرنے اور منصب انسانیت کو حاصل کرنے کی بجائے اپنی زندگیاں احوال و اسباب سے متاثر ہونے میں بسر کر دیں، وہ دراصل کافر یعنی اپنے خالق کے فضل و کرم سے، اور اپنے آپ سے اور اپنے مقام سے منکر ہیں اور احوال و اسباب کی غلامی و اسیری ہی اُن کے کفر کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

ان کے خلاف، وہ اقوام و افراد جو ذات باری کے ساتھ ساتھ اپنے آپ پر بھی ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نیابت کے صحیح مفہوم کو سمجھا، اور پایا، اور جنہوں نے اِس زمین پر اُس مالکِ ارض و سما کی بادشاہت کے قیام کا بیڑا اٹھایا اور دنیا کے چھوٹے چھوٹے منافع پر نظر رکھنے اور متاعِ حیات کی غلامی اختیار کرنے کی بجائے وہ کار ہائے خیر انجام دیئے جو اُن کے منصب عالی کے شایان شان تھے، ان پر کائنات کی وسعتیں کھل گئیں اور آفاق اپنی تمام دوریوں کے باوجود اُن کے عرصہ ہائے عمل کی حدود میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔

یہی نکتہ انسان کے اصل مقام اور فطرتِ خداوندی کے منشائے حقیقی

کا عکاس ہے اور یہی وہ معیار ہے جو کفر و ایمان کو جدا جدا کرتا اور کافر و مومن کے مقام و انجام کے تعین و تشخص میں جو یائے حق کی رہبری و دستگیری کرتا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق

---

(۳)

تو اپنی سرگزشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اگرچہ یہ قول راسخ آپ نے اور ہم نے بلیسیوں بار سُنا ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری، لیکن جس انداز سے یہ قول ہمارے اپنے عہد میں شاعرِ مشرق کے کلام پر صادق آیا ہے۔ اس کی مثال نایاب نہیں، تو کم یاب ضرور ہے۔ حضرت علامہ نے آج سے کم و بیش تیس برس پہلے اپنے مشہور ساقی نامے میں صاف فرما دیا تھا کہ ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

لیکن "تاریخ" کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ چین کی حیاتِ تازہ اور سرزمینِ ہمالہ یعنی

تبت کی بیداری ابھی کل کی بات ہے۔ اس گزارش سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ حکیم الامت کو علمِ غیب حاصل تھا بلکہ محض یہ مطلوب ہے کہ بعض آنے والے واقعات ضمیرِ شاعر پر اپنا پیش روسایہ اس انداز سے ڈال رہے تھے کہ اس کی زبانِ حقیقت ترجمان ان کے وجود کے اظہار پر مجبور ہو گئی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس الہامی شعر میں ہے جو آج کی صحبت میں ہمارے پیش نظر ہے۔

حکیم الامت جب یہ فرماتے ہیں کہ ؎

تو اپنی سرگذشت اب اپنے قلم سے لکھ

تو لا محالہ ان کا روئے سخن اس قوم تازہ کی طرف ہوتا ہے جو عرصۂ عمل میں ابھی ابھی اتری ہے اور ان کے زمانۂ حیات میں اترنے والی تھی اور پھر جب وہ ارشاد کرتے ہیں کہ ع

خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

تو ظاہر ہے ان کا خطاب اسلامیانِ عالم سے نہیں، کہ ان کی جبین پر تو سعادت و اقبال کے نقوش گزشتہ ایک ہزار برس تک تاباں و درخشاں رہے ہیں۔ بلکہ اس خطۂ خاص کے نوجوانانِ اسلام سے ہے جس کے فرزندوں کو اب تک تاریخ میں آزادانہ طور پر کوئی کارنامۂ عظیم سرانجام دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اہلِ نظر سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ صبح تاریخ، یعنی کم و بیش سکندرِ اعظم کے حملے کے زمانے سے لے کر آج تک اس سرزمین کے باشندے غیروں ہی کے کام آتے اور انہی کی جنگیں لڑتے رہے۔ تاریخ کے اوراق اُن کے اپنے

کارناموں کے کسی تذکرے سے بالکل تہی دامن ہیں۔ اور شاعر کے یہ الفاظ کہ

خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اسی حقیقتِ کبریٰ کی تفسیر پیش کرتے ہیں۔

یہ ارضِ پاک جو اپنے وجودِ تازہ کے لئے حکیم الامت کے تخیل اور قائدِ اعظم کے عمل کی مرہون ہے، منصوبۂ خداوندی میں ایک ایسا مقام امتیاز رکھتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس کے فرزند، بالخصوص اس کے نوجوان اپنے منصب عالی کو پہچانیں اور اس کردارِ عظیم کو ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں جو فطرتِ الٰہی نے اُن کے لئے ازل سے مخصوص کر رکھا ہے اور جس کی طرف عہد حاضر کے مفکرِ عظیم اور شاعرِ کبیر نے بار بار انہیں پکارا ہے۔ پھر کون ہے جو ساعتِ موعودہ کے گزرنے سے پیشتر اس دعوت کو لبیک کہے اور شاعرِ مشرق کی اس نوید دل نواز کو حقیقت کا جامۂ سرمدی پہنا دے کہ ؎

نوا اپنی سرگزشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

(۴)

نماز روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے

زمانے کی ہر تحریک اور زندگی کا ہر ادارہ اپنے وجود کے قیام اور اپنے آئین کے فروغ کے لئے چند قوانین وقواعد ضرور رکھتا ہے کہ یہ صرف اس کے نظم و انضباط کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے تابعین و متعلقین کی اندرونی تہذیب و تربیت کی ضمانت بھی مہیا کرتے ہیں۔ انہی اداروں میں ایک اہم ادارہ مذہب بھی ہے اور از بسکہ اس کے دائرۂ اثر میں روزِ ازل سے انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد شامل و محصور رہی ہے، اس لئے اس کے آئین و قوانین کی اہمیت و افادیت کو بھی ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل ہے۔ لیکن غور کیجئے تو آئین سے پیدا ہونے والے فرائض بھی اسی وقت تک موجبِ رحمت و برکت اور باعثِ رشد و ہدایت ثابت ہوتے ہیں، جب تک خود آئین و قوانین کی روح برقرار رہتی ہے اور فرائض کے اجسام میں

زندگی کا خون دوڑتا چلا جاتا ہے۔

حضرتِ علامہ کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ اگر مسلمان روح اسلام سے محروم ہو جائیں اور وہ مقاصدِ عالیہ ان کے پیش نظر نہ رہیں، جن سے اصلِ دین عبارت ہے اور جن کے حصول کے لئے فطرتِ الٰہی نے نیابت خداوندی کا منصبِ جلیل تخلیق کیا تھا، تو ظواہر مذہب بے اثر و کیف ہو جاتے ہیں۔ اور پھر زوالِ ملت کہ زوالِ دین کی ہی دوسری صورت ہے کسی طور رک نہیں سکتا۔

یہ نکتہ کسی سے مخفی نہیں کہ ادیانِ عالم میں یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور ایک سچے مسلمان کو ہر سانس کلمۃ الحق کے اعلاء اور اس کی ہر جنبش رضائے الٰہی کے حصول کے لئے وقف ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ اس کے پیکر لطیف میں روح اسلام سر بسر جاری ہو اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ وہ حقوق و فرائض ادا کرتا چلا جائے جو خلافت ربانی اور انسانیتِ عظمیٰ سے خاص ہیں۔

حکیم الامت جب دورِ حاضر کے مسلمان سے بالخصوص یہ خطاب فرماتے ہیں کہ ارکان و ظواہر مذہب تو بدستور اپنی اپنی جگہ قائم ہیں مگر تو باقی نہیں ہے تو اس سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے۔ کہ ارکانِ دین تو زوال سے بالاتر ہیں خود ہم ہی روح دین سے بے گانہ ہو گئے ہیں اور ہمیں نے ارکان و ظواہر کے ڈھانچے کو مقصودِ بالذات سمجھ کر اس مقصدِ اعلیٰ کی طرف سے غفلت اور بے خبری اختیار کر لی ہے جو تخلیق مومن میں خالقِ اکبر کے پیش نظر تھا۔ خداوندِ جلّ و علیٰ نے

مومن کامل کو اس دنیا میں اپنی نیابت محض اس لئے عطا فرمائی تھی کہ وہ اس جہانِ خراب کی تہذیب و تنظیم مسلسل میں ارکانِ مذہب کی بجاآوری سے فقط اعانت کا طالب ہو۔

مقامِ افسوس ہے اور حکیم الامت اس افسوس کے اظہار میں قطعاً قائل نہیں فرماتے ہیں کہ دورِ حاضر کا مسلمان اپنے صحیح موقف پر قائم نہیں رہا، اور اس شیوۂ عمل سے عاری اور اس مدعائے حقیقی سے بے خبر ہو گیا ہے جو منصوبۂ خلافتِ الٰہی میں جلوہ آرا اور کار فرما تھا۔ اب اس کی حیثیت محض ایک پیکرِ بے روح کی ہے، جو عبادات سے تو منکر نہیں لیکن اپنے آپ سے منکر ہو چکا ہے، جو نماز و روزہ اور حج پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن خود اپنے درجات اور اپنی حمکنات پر ایمان نہیں رکھتا۔ اور اس لئے عملاً وہ منصب ترک کر چکا ہے جو اُسے بارگاہِ حق سے ارزانی ہوا تھا۔

حضرتِ علامہ اس نقصانِ عظیم کو نہایت شدت سے محسوس فرماتے ہیں جو کارگاہِ کائنات میں خود مومن کے گم ہو جانے سے واقع ہوا ہے کیونکہ اس منصوبۂ عالی میں اولین حیثیت تو مومن ہی کو حاصل تھی۔ اس کی عبادات و معمولات کا درجہ ایک ثانوی کیفیت رکھتا ہے۔ پس مومن کا باقی نہ رہنا نہ صرف انسانیت کے لئے ایک خسارۂ عظیم ہے، بلکہ خود خالق کائنات بھی اس نقصان کو محسوس کرتا اور شاعر کی زبان سے اس کا برملا اظہار یوں فرماتا ہے کہ ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(۵)

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

فطرتِ انسانی کا نفس پرور اور باطل پرست پہلو آغازِ عالم سے لے کر آج کے دن تک غیر اللہ کی پرستش میں اپنے نفس امارہ کی تسکین اور اپنی ادنیٰ خواہشات کی تکمیل کا جویاں رہا ہے۔ اس نے خیر اور مبداء خیر کی طرف سے ہمیشہ روگردانی کی اور شر اور منبع شر کو ہمیشہ اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنایا۔ وہ چشمۂ آبِ حیات کی فیض سامانیوں سے متمتع نہ ہوا اور طلسم زارِ ہستی کے سرابوں کی طرف برابر لپکتا رہا۔ نفس انسانی کی یہ سرتابیاں روزِ ازل سے جاری ہیں۔ اور جب تک کائنات میں روحِ ابلیس زندہ ہے۔ اسی طرح جاری رہیں گی ۔ لیکن ازبسکہ رضائے الٰہی بقائے خیر کی ضامن اور قیامِ امن وسلام کی کفیل ہے، اس لئے عباد الصّٰلحین کو ہمیشہ یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ گمراہ انسانوں کے جھوٹے سہاروں

اور پر فریب مسجودوں کو پاش پاش کرتے اور نسلِ آدم کو خالقِ ارض و سما کی لاانتہا رحمت و اعانت کی طرف بلاتے رہیں۔ یہ شرف انبیاء علیہم السلام سے لے کر صالحین و کاملین اور سلاطین و فاتحین تک کے حصے میں صدیوں تک آتا رہا۔ اور لاکھوں بندگان خدا ان کی مساعی جمیلہ سے رشد و ہدایت حاصل کرتے اور زندگی کے سچے سہاروں اور اس کی حقیقی نعمتوں سے بہرہ یاب ہوتے رہے۔ جناب خلیل اللہ اگر اس سلسلۂ زریں کے حلقۂ اولین کی حیثیت رکھتے تھے تو سلطان محمود غزنوی کو بھی اس میں منسلک ہونے کا شرف حاصل تھا۔

اور یوں ہی صدیاں گزرتی گئیں اور کتابِ زمانہ کے اوراق پلٹے جاتے رہے۔ اور ابلیس انسان کو نئے نئے بتوں کا تراشنا اور انہیں پوجنا سکھاتا چلا گیا۔ جناب ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں بھی گمراہ لوگ پتھروں کو پوجتے تھے اور سلطان غزنوی کے دور میں بھی وہ بتانِ سنگین کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنی مرادیں مانگتے تھے۔ لیکن مرورِ ایام سے بتکدوں اور مندر کی دل کشی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ اور انسان اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے بتوں سے آہستہ آہستہ بے زار ہوتا چلا گیا۔ ابلیس نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور ابن آدم کے سینہ و دل میں اپنے نئے صنم کدوں کی بنیاد رکھدی اور لات و منات اور دھار دیو و سومنات کی بجائے حرص و آز نفرت و خود غرضی اور زر طلبی و اقتدار پرستی کے غیر مرئی صنم ان میں بسا دیئے۔ اور اس انقلاب خیز اقدام میں اس کی سب سے

بڑی جیت یہ ہوتی کہ علیحدگی و امتیاز کی وہ ظاہری دیواریں جو دیر و حرم اور کعبۂ و صنم خانہ کو جدا کرتی تھیں۔ آن واحد میں مسمار ہو گئیں اور مومن و کافر دونوں ان نئے بتوں کے پجاریوں میں برضا و رغبتِ تمام جوق در جوق شامل ہوتے چلے گئے۔ لاریب کہ یہ بُت چشم ظاہر کو نظر نہیں آتے لیکن ہم میں سے بیشتر افراد دن رات اپنے قلوب میں انہی کی پرستش کئے جاتے ہیں اور ان پرستاروں میں اہل کنشت بھی شامل ہیں اور اہل حرم بھی۔ شاعرِ مشرق اس اندوہ ناک کیفیت سے جو تاثر قبول کرتا ہے اس کی تلخی و حرارت اس کے حرف حرف سے آشکار ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف ایک طغیانِ کفر کو اُمڈتا دیکھ رہا ہے۔ اور اس کی ظلمت کاریوں میں اس کے لئے سب سے المناک منظر یہ ہے کہ وہ اہل حرم جن کا اوّلین فریضہ و منصب یہ تھا کہ ہستی کی ردائے تیرہ کو اپنے نفس آتشیں سے شعلہ بداماں کر دیں وہ خود اس کے سیاہ دامنوں میں سمٹتے چلے جا رہے ہیں اور نہیں جانتے اور نہیں محسوس کرتے وہ خدائے برتر و توانا اور بے نیاز و بے پروا کے بندے کہلانے کے باوجود ابلیس کے پھیلائے ہوئے اس دامِ تنویر کی اسیری کیسی خوبی و آسانی سے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔

اور پھر ایک عالمِ حزن و یاس میں شاعر کسی ایسے غزنوی کی راہ دیکھتا ہے جو اپنے گرزِ صنم شکن سے ہمارے دلوں کے ان بتوں کو پاش پاش کر کے ہماری جبینوں کو از سرِ نو اُس حرم کی خاک سے آشنا

کردے، جو اس دنیا میں خداوند قدوس کی بادشاہت قائم کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ اور جو آج خود اہلِ حرم کی بت سازیوں اور بت پرستیوں کے طفیل رسوا ہوتا چلا جا رہا ہے۔

کیا نہیں اور غزنوی کارگہہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات

(۶)

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کُہسار پرنیان و حریر

یہ امر کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں کہ فکرِ اقبالؔ کا قصرِ رفیع الشّان جن ستونوں پر قائم ہے، ان میں سب سے اہم اور سنگین ستون خودی کے اعتماد افروز نام سے موسوم ہے اور اسی کو تصوّراتِ شاعر کے مرکز اور اس کے پیغام کے محور ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لیکن ایک عجیب و غریب بات ہے کہ ہم لوگوں میں جتنی غلط فہمی اور جتنا انتشار اس لفظ اور اس کے تصورات و مضمرات کے بارے میں پایا جاتا ہے، لغاتِ اقبالؔ کے کسی اور لفظ یا ترکیب سے اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

پھر یہ بات بھی اقبالؔ کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہے، کہ خودی کا تصور مستقل پہلے پہل حضرتِ علّامہ کے فارسی کلام میں رونما ہوا وہیں اس نے فروغ و ارتقاء کی اولین منازل طے کیں اور پھر ان کے دورِ ثانی

کے اُردو کلام میں اس انداز سے در آیا کہ عزّ و شرف کے بکھرے ہوئے تصوّرات اس کے جلو میں اور سطوت و صولت کے روایات اس کے آگے آگے رواں تھے جس کسی نے منظر دیکھا، وہ ایک عالم حیرت و مسرّت میں گم ہو گیا اور اگرچہ پیمبر خودی نے اپنے شعرِ غریب میں اس الماسِ ہزار پہلو کو ہر رنگ میں پیش کیا اور اس کی تشریح و توضیح میں سعیٔ بلیغ فرمائی۔ لیکن وہ غبارِ اسرار جس نے اس تصوّرِ نایاب کو محیط و ملفوف کر رکھا تھا، شاید آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح وہ صاحبِ پیامِ خودی کے ایامِ زندگانی میں قائم تھا۔

اقبالؔ کو خودی کا تصوّر بے حد عزیز و محبوب تھا۔ اور یہی محبت اُن کے بیانِ خودی کی تیرنگیوں اور نزاکتوں کی آفریدگار ہے۔ اس کے باوجود یہ تصوّر ایسا سادہ اوصاف بھی ہے کہ ایک عام آدمی کے لئے اسے نقشِ قلب و ذہن بنا لینا کچھ ایسا دشوار نہیں۔ میری ناچیز رائے میں خودی کا تصوّر ایک مرکب تصوّر ہے جو تین واضح احساسات کو بیدار و منظم کرتا اور سامنے لاتا ہے۔ پہلا احساس اپنی رفعت و عظمت کا وہ احساس ہے جو اس دنیا میں خدا کا نائب اور اس کی صفاتِ عالیہ اور اسمائے حسنٰی کا وارث ہونے کے اعتبار سے انسانِ کامل کی فطرت میں جاگزیں ہونا چاہیئے۔ دوسرا احساس ان ممکناتِ بے نہایت کا احساس ہے جو اشرف المخلوقات ہونے کے لحاظ سے اس کی حدودِ عمل میں محصور ہیں۔ اور تیسرا احساس اُس یقینِ کامل سے پیدا ہوتا ہے جو مومن اپنی تخلیق کے مقاصد پر رکھتا ہے۔ پھر جب یہ تینوں احساسات مجتمع ہو کر ایک حیات افروز کیف کی صورت اختیار

کر لیتے ہیں، تو اقبالؔ کی زبان میں ہم اسے خودی کی کیفیت بیداری قرار دیتے ہیں اور صاحبِ کیفیت سے عظیم ترین کارناموں اور شریف ترین طرزِ عمل کی بجا طور پر توقع رکھ سکتے ہیں۔

حکیم الامت دورِ حاضر کے مسلم نوجوان کے دل میں یہی کیفیت نایاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اُن پر یہ راز منکشف ہو چکا تھا کہ فطرتِ الٰہی اُسے عنقریب نعمتِ آزادی سے سرفراز کر کے اس کی صلاحیتوں کا امتحان لینے والی ہے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ اس امتحان میں پورا نہ اترا تو وہ دنیا کی دوسری نوزائیدہ چھوٹی قوموں کی طرح اپنے قدموں پر قائم ہوتے ہی لڑکھڑا جائے گا۔ لیکن اگر اُس نے اپنی تخلیق کے تقاضوں، اپنی نیابت الٰہی کے فرائض اور اپنی وہبی قوتوں کی ممکنات کو حاصل کرنے کی سعئ بلیغ کی تو وہ دنیا کی پُر صعوبت زندگی اور اہلِ دنیا کی شدید مخالفت پر یقیناً غالب آجائے گا اور پھر جس طرف اس کی نگاہ اٹھے گی، کائنات اس کے سامنے اپنا سر جھکاتی چلی جائے گی۔ اسی لئے فرمایا کہ ؎

خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پر نیان د حریر

---

(۷)

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

فکر و سخنِ اقبالؔ میں خودی کے بعد جس تصور کو ایک مقامِ عظمت و امتیاز حاصل ہے وہ عشق کا تابناک اور ہمہ گیر تصور ہے۔ اقبالؔ نے ہماری زبان کو پہلی بار عشق کے وہ معانی خد و خال دئے جن سے آج شعرِ اقبالؔ کے ایوان جگمگا رہے ہیں اور جن کی روشنی ان کی پہنائیوں سے نکل نکل کر فضائے ملت کو درخشاں اور چشم مومن کو مستنیر کر رہی ہے۔ اقبالؔ کا عشق ایک تراشیدہ ہیرا ہے جس کا ہر پہلو ایک بے مثال آب و تاب کا سرمایہ دار ہے اور جس کا پرتو دنیائے قلب و نظر میں ایک کیفیت نایاب پیدا کرتا ہے۔ وہ پیک ایمان بھی ہے اور عمل بھی، بیازمندی اور تونگری بھی، صبر بھی ہے اور جدل بھی، صلابت بھی ہے اور سپردگی بھی اور ان تمام کیفیتوں کے باوصف نہ اس کی کوئی مستقل حدود ہیں اور نہ ان کی کوئی جامع مانع تعریف و تشریح پیش کی جا سکتی ہے۔ بس

یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ آدمِ خاکی جب اس جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے تو آسمانوں کی رفعتیں اس پر آسان اور آفاق کی حدود اس کے سامنے تحلیل ہو جاتی ہیں اور وہ ان پابندیوں اور گراں بار زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے جنہیں خوف جنم دیتا اور شعورِ حساب و شمار ناقد د عائد کرتا ہے۔

حضرتِ علامہ کے ہاں عقل عشق کی سب سے بڑی حریف ہے زبانِ اقبال میں عقل سے مراد وہ احساسِ عدیدی و شمار رساں ہے جو کمزور اور کم نظر انسانوں میں زمانے کے اسباب اور قوتوں سے مرعوب ہو جانے کے باعث پیدا ہوتا اور ان کے تخیل، ان کے جذب و شوق اور ان کے اقدام و عمل کو محدود کرتا ہے۔ اس کی کارفرمائی سے وہ "دو اور دو چار" کے چکر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اور مدۃ العمر اس سے نکل نہیں پاتے۔ بخلاف اس کے عشق انسان کو خدائی طاقتوں سے بہرہ ور کرتا اور ایسے پر پرواز عطا کرتا ہے جو اسے مادی حدود سے ماورا طے کر کے ان رفعتوں پر پہنچا دیتے ہیں، جہاں سے جہانِ آب و گل اور اس کے کاروبار اسے ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔

حکیم الامت یہ بات بڑی شدت سے محسوس فرماتے ہیں۔ کہ ان کی قوم کے زندہ افراد میں اگر اعلیٰ مقاصدِ حیات سے عشق پیدا نہیں ہوگا تو وہ اقوامِ عالم کے ریلے میں پس جائے گی۔ عقل یعنی نفع و ضرر کا مادی احساس و شمار عام انسانوں کو بڑے وفور سے عطا ہوا ہے۔ اور اسی کی بدولت وہ دنیا میں اپنی زندگی کی چند گھڑیاں کسی نہ کسی طرح بسر کر لیتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ انسانی اقدار کے حصول، دنیا میں آئینِ خداوندی کے نفاذ، عظیم مادی

قوتوں کے مقابلے میں ایک حصارِ خیر کی تعمیر۔ یہ مقاصد عالیہ اُس جذبہ بے نہایت کے بغیر تکمیل نہیں پا سکتے جو موانع اور حدود کی پروا نہیں کرتا بلکہ جبریل کے پر لگا کر اِس عالمِ کون و مکاں کی فضاؤں میں بلند پرواز ہوتا اور حالات کی ناسازگاریوں اور موانع کی صلابتوں کو محض اپنی وہبی شدت اور پاکیزگی و طہارت کی قوّت سے تسخیر کر لیتا ہے۔ شاعرِ مشرق کی اصطلاح میں یہی جذبہ، جذبہ عشق ہے۔

پھر اس کی کارفرمائیوں کی نیرنگیاں بھی دیدنی ہیں کبھی وہ کاملِ تسلیم و رضا ہے کہ منشائے ربانی کی تکمیل کے راستے پر تحفّظِ نفس کا سایہ تک پڑنے نہیں دیتا اور کبھی وہ یکسر روحِ مقابلہ و جہاد ہے۔ کہ قوّت و اکثریت بے نہایت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور رنگ و فولاد سے اس طرح ٹکرا جاتا ہے کہ اس تصادم سے پیدا ہونے والا شعلہ چشمِ عالم کو صدیوں تک خیرہ کئے رکھتا ہے اِسی دوگونہ کیفیتِ انفعالی و فعالی کو حضرتِ علّامہ نے اپنے شعرِ بے مثال میں یوں اسیر کیا ہے کہ ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

(۸)

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

مومن کے بعد انسانیت کا جو تصوّر حالیؔ اقبالؔ عصرِ حاضر کے نوجوان کے سامنے پیش کرتا ہے وہ قلندر کا تصوّر ہے۔ پھر مومن اور قلندر کے درمیان جو ایک نازک سا فرق ہے، اس کا صحیح احساس تو اقبالؔ کے کسی طالب علم کو شعرِ اقبالؔ کے مطالعہ غائر ہی سے ہو سکتا ہے، لیکن ہم حامیوں کے لئے "قلندر" مومن ہی کی ایک ذرا اکھڑی سی صورت ہے۔ جو اس کے جلال، بے نیازی اور بے خوفی کے امتزاج سے تشکیل پاتی اور کارگاہِ حیات میں ایک لطیف و جلیل کردار ادا کرتی ہے۔ قلندر کی سب سے دلنواز خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اپنی کوئی غرض نہیں رکھتا، اسی لئے اس میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک صاحبِ ہمّت انسان جب کسی مہم پر اپنی توجہ مرکوز کرے گا اور اس کی انجام دہی سے اس کی اپنی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہوگی تو لازماً بلکہ زمانہ خیر کامل کے آگے ہمیشہ اپنا

سر جھکا دیتا ہے، وہ اس کے سامنے بھی اپنا سر جھکا دے گا۔ اور انصرام امور میں قلندر کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہے گا۔ یہی فوز کبیر کا وہ مقامِ محمود ہے اور یہی نصرتِ حق کا وہ لمحۂ نایاب ہے جو مردانِ صفا کیش کو نصیب ہوتا ہے اور اسی کے اعجاز سے ان کی قلندرانہ بے سروسامانیاں تقدیرِ ربانی کی تکمیل اور رضائے الٰہی کے نفاذ میں صرف ہوتی اور اس تیرہ خاکدان پر آسمان کی روشنیاں پھیلاتی چلی جاتی ہیں۔

حضرت علّامہ کے ضمیرِ روشن پر یہ حقیقت بدرجۂ غایت عیاں تھی کہ اس برِعظیم کی ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی طبائع میں جب تک ایک مستقل بے خوفی پیدا نہیں ہو گی وہ قوموں کے ہجوم میں اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر پائیں گے۔ اور یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ خوف ہمیشہ ادنیٰ مفاد کے زائل ہو جانے کے خطرے سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامّت نے انہیں ادنیٰ اسباب دنیا سے بے نیازی اور سادہ مقاصدِ حیات سے بے التفاتی کی طرف پکارا کہ اسی طریقِ زندگی اور اسی حکمتِ عملی میں وہ نکتہ پوشیدہ ہے جو اللہ کے بندوں کو زمانے کی ناہمواریوں پر غلبہ دلاتا اور فلکِ کج رفتار کی زمام ان کے دستِ حق پرست میں تھما دیتا ہے۔

بے خوفی اور زوالِ نعمت سے بے خوفی، فرد اور اجتماع دونوں میں ایک اُلوہی شانِ بے نیازی پیدا کر دیتی ہے اور بندہ جب مولا کی اس صفتِ کاملہ سے آراستہ ہو کر انصرامِ امور کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دولتِ دنیا اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس کے پیروں میں لوٹنے لگتی ہے۔ پھر وہ اسے اپنے قدموں کی

خاک تو بنا لیتا ہے مگر اپنی آنکھوں کا سرمہ نہیں بناتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جلال وجبروت جو اسے بارگاہِ حق سے عطا ہوتا ہے، اس کی ذات میں برقرار رہتا ہے۔ دنیا کے اسباب فنا ہو جاتے ہیں، دولتیں خاک میں مل جاتی ہیں، اقتدار کی کرسیاں دیکھتے دیکھتے الٹ جاتی ہیں اور وہ ابنائے آدم جو ان سے وابستگی ہی کو مقصودِ حیات سمجھتے ہیں، خود بھی ان کے ساتھ ذلّت و نکبت کی پستیوں میں گر جاتے ہیں۔ لیکن قلندر کے رخِ دل کش پر آسمان کی روشنی اسی طرح دمکتی رہتی اور اس کے تبسم دل آویز کو ابدیت عطا کرتی چلی جاتی ہے، وہ زمانے کے دریائے پرشور پر ایک نگاہِ استہزا ڈالتا ہے کہ اس کی بلند ترین موجیں بھی اس کا سرِ دامن آلودہ نہیں کر سکتیں اور پھر تقدیر کے اس تیر کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھ جاتا ہے جو زمانے کی کمان سے چھٹ جانے کے باوجود اس کی بے نیازی، بے غرضی اور بے خوفی کی حدود اور اس کی قاہرانہ دسترس سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکا۔

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات!
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

(۹)

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

زندگی اور موت میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے اور جس سے وجود و عدم کا فرق بیک نظر نمایاں ہوتا ہے، بلاشبہ وہ حرکت ہے۔ اور اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس عالم ہست و بود کی رونق جس شے سے قائم ہے اور کائنات کا سالمن جس اعجاز سے چل رہا ہے اور منصوبہ خداوندی میں جو روح کارفرما ہے، وہ حرکت اور محض حرکت ہے اور عمل اور نمود اور انجام اور نتیجہ اور فروغ اور کامرانی اور وہ تمام کیفیات جو آپس میں مل کر زندگی کی تشکیل کرتی ہیں، حرکت ہی سے جنم لیتی اور اسی کو زندگی کی گوناں گوں صورتوں میں منتقل کرتی چلی جاتی ہیں۔

یہ امر ہمارے لئے باعثِ فخر و امتنان ہے کہ مشرق کے بیشتر شاعروں کے خلاف، ہمارے قومی شاعر نے اپنے نغموں میں جو جادو جگایا اور اپنے شعر کو

جس روح سے زندگی جاوداں عطا فرمائی وہ جادو اور وہ روح حرکت ہی سے مستعار ہے اور حرکت و عمل ہی کا وہ تڑپتا ہوا پیغام جو سخنِ اقبال کے جسم میں خونِ گرم کی طرح جاری و ساری ہے، اس کی سب سے توانا و تابناک کیفیت کا درجہ رکھتا ہے۔

حسنِ فطرت اور جمالِ انسانی کی کوئی دل آویزی اور عشق اور سوز و گداز کی کوئی کیفیت ایسی نہیں جسے شاعرِ مشرق نے اپنے اعجازِ سخن سے بہ کمالِ لطافت پیرایۂ اظہار عطا نہیں فرمایا اور بوستانِ زندگی کی کوئی خوشبو اور شبستانِ حیات کی کوئی سرمستی ایسی نہیں جسے اس کے سحرِ بیاں نے اسیرِ الفاظ نہیں کیا۔ لیکن اُس کے جہانِ سخن کی زندگی اس روحِ عمل سے ہے جو بجلی کی ایک رو کی طرح اس کے آب و گل میں جاری و ساری رہتی اور اُس کے مخاطبین کو اس کا پیغامِ عمل ہر لحظہ و ہر آن پہنچاتی رہتی ہے۔ یہی وہ کیفیت نایاب ہے جو شعرِ اقبال کو ایک ندائے سرمدی کا امتیاز بخشتی اور اسے شاعری کی حدود سے نکال کر پیغمبری کی وسعتوں میں گم کر دیتی ہے۔

لیکن اقبال کا پیغامِ عمل فقط ایک تحریک کا درجہ نہیں رکھتا وہ ساکن و جامد کو حرکت و روانی عطا کرنے کے علاوہ اسے اس مقام تک بھی لے جاتا ہے، جہاں حرکت زندگی کے امتحان میں قدم رکھتی اور اپنے وجود کا جواز پیش کرتی ہے۔ یہ مقام، مقامِ تصادم ہے اور اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ تصادم ہی درحقیقت تکوینِ وجود کا باعث ہوتا اور زندگی کو از سرِ نو تازہ کرتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ جویائے تصادم ہے اور

سلسلۂ حیات قائم اور ذوقِ حیات باقی ہے۔ یہی جستجو عناصرِ زندگانی کو اس کی ہر سطح اور ہر منزل پر بیدار کرتی اور انہیں باہم متصادم کر کے زندگی کی نئی اور برتر کیفیتوں کی تخلیق کرتی ہے۔ تا آنکہ سطحِ اشرف و اعلیٰ پر یہ سلسلۂ عمل، کردارِ انسانی میں اظہار پاتا اور انسانی زندگی کے مسلسل فروغ وارتقا کا باعث بنتا ہے۔ پھر از بسکہ تصادم ہی حرکت کا مقصود اور عمل کا منتہا ہے اور اسی سے کائنات کا تسلسلِ حیات قائم رہتا اور منشائے ربانی تکمیل پذیر ہوتا ہے اس لئے جہانِ انسانی میں بھی وہ افراد و اقوام جو تصادم سے گریز کرتے اور اپنے قویٰ کو امتحان و آزمائش میں نہیں ڈالتے حقیقت میں منشائے خداوندی سے اعراض کرتے ہیں اور اس گریز و فرار کا بالعموم یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے فطری قویٰ کمزور ہو کر عمل کے قابل نہیں رہتے۔ پھر زوال بہت انہیں آلیتا ہے اور ان کے سفرِ زندگی کو نہ صرف مختصر کر دیتا بلکہ انہیں اس ذلت و محرومی سے بھی آشنا کر دیتا ہے جو دنیا میں کمزور افراد و اقوام کا حصہ ہے۔

اسی پارۂ حکمت میں حضرت علامہ نے ایک اور نکتۂ نادر فرد اور ملت کے رشتہ باہم اور فرد کے صحیح مقام و مقصدِ زندگی کی نسبت ارزانی فرمایا ہے۔ فرد لاریب، ملت کے بحرِ بے کراں کی ایک موجِ رقصاں و رواں ہے۔ لیکن جب تک یہ موج بحر میں سے اٹھ کر ساحل سے نہیں ٹکراتی۔ یعنی منصوبہ کائنات میں اپنے وجود کا جواز پیش نہیں کرتی۔ وہ اپنے تقاضائے تخلیق کو یقیناً پورا نہیں کرتی اور یہی ناکامی و نارسائی حکیم مشرق کی نگاہ میں

مقامِ گریہ افسوس ہے۔

حکیم الامت اپنے سخن میں اپنی ملّت کو حرکت کی نعمتِ لازوال اور اس سے پیدا ہونے والے تصادم کی فتوحات و برکات کی بار بار نوید دیتے ہیں اور اسی مقصد سے زمین و آسمان کی نشانیوں اور مظاہر کی طرف بار بار متوجہ فرماتے ہیں۔ کس قدر سچ فرمایا ہے کہ ؎

اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

(۱۰)

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

حرم کی داستان اس جہانِ پر عصیاں میں ربوبیت خداوندی اور عبودیت آدم کی داستان ہے۔ ایک ایسی ربوبیت کی داستان جس کی حکمت و رحمت نے ایک طفلِ معصوم کی ایڑیوں کی رگڑ سے آبِ حیات جاری فرما کر ایک وادیٔ ویران کو شادابیٔ ابد عنایت فرمائی اور ایک جوانِ صالح کے جذبۂ تسلیم و رضا پر دنیا کے آخری اور اکمل دین کی بنیاد رکھی کہ صدق ابراہیم اور ایثارِ اسمٰعیل ہی مذہب تسلیم و رضا یعنی دینِ مبینِ اسلام کے عناصر اولین ہیں۔ حکمتِ خداوندی کو اپنے پیغام کی تجدید اور حق و صداقت کے استقرار کے لئے ہمیشہ ایک کردارِ عظیم کی جستجو رہتی ہے۔ کئی ہزار برس ہوئے کہ تسلیم و ایثار کا ایک جوہر نایاب اُسے اسمٰعیل علیہ السّلام کے پیکر مبارک میں نظر آیا، چنانچہ فطرت کے ایک عجیب و غریب منصوبے کے ذریعے اُسے وادیٔ بطحا میں

منتقل کیا گیا اور صعوبتوں اور شدائد سے معمور ایک طویل تربیت کے بعد ایک عدیم النظیر امتحان میں سے گذارا گیا اور پھر اُسے تعمیر حرم اور تقویم اسلام کا وہ شرف کبیر بخشا گیا جو اپنی عظمت و سطوت کے اعتبار سے ایک ایسے ہی عظیم و بے مثال کردار کا طالب و متقاضی تھا۔ یہ اس داستانِ غریب کا آغاز تھا اور یہی اس کے کردار اولین کا نقطۂ عروج کہ تعمیل و تسلیم میں جس کی سادگی ہزار حکمتوں پر خندہ زن اور کار فرمائی میں جس کا عمل ہزار منصوبوں پر گراں ثابت ہوا۔

اور پھر زمانہ کروٹیں لیتا چلا گیا اور بیسیوں صدیاں گذرتی گئیں، تا آنکہ حکمتِ خداوندی کو پھر ایک بار اس عہد کی تجدید کی ضرورت محسوس ہوئی جو عبودیت نے ربوبیت سے استوار کیا تھا اور جس کے تقاضے مجد و شرف انسانی کی بلند ترین رفعتوں کے حریف اور جس کے امتحانِ سقراط و مسیح کی آزمائشوں سے بھی بالاتر تھے۔ اور اب کے اس امتحانِ عظیم کا قرعۂ فال انسانیت عظمیٰ کے اس نمونہ کامل کے نام پڑا جو حسین بن علیؑ کے نام نامی سے موسوم اور سید الشہداء کے عُرفِ گرامی سے معروف ہے۔

جنابِ حسین علیہ السّلام کا کردارِ عظیم داستانِ حرم کے سلسلۂ سادہ و رنگین کا آخری حلقہ ہے اور از بسکہ راہ حق میں ایثار و قربانی کی اس سے غریب تر مثال دائرہ امکان میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ داستان اسی حلقے پر تمام بھی ہو جاتی ہے اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں، تاریخ انسانی کے اوراق اس کی رنگینیوں کے امین رہیں گے اور خونِ حسین کی سرخی انہیں ابد تک تاباں و

فروزاں رکھے گی۔ اسمعیل کا ایثار اپنی جگہ بے مثال و بے نظیر تھا، لیکن تقدیرِ خداوندی نے اس کی تکمیل کو محض تسلیم و رضا تک محدود رکھا تھا۔ برشِ شمشیر وسناں کی ہولناکیوں میں سے نہیں گذرا تھا۔ پھر اسمعیل کی تسلیم ایک ندائے ربانی کی فوری تعمیل تھی، فساد وشر کی قہرمانیوں کا ایک اذیت ناک مقابلہ نہیں تھا۔ یہ سعادتِ عظمیٰ حسین علیہ السّلام کے حصے میں آئی اور اُس مردِ عظیم نے خلافتِ الٰہی کے تقدس کو اپنی اور اپنے اعزہ واعوان کی اجتماعی قربانی سے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے حیاتِ جاوید بھی عطا فرمائی اور اس انداز سے عطا فرمائی کہ چشمِ فلک جو اس منظر کو آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک عالمِ حیرت میں دیکھ رہی تھی، آج بھی اُسی طرح کھلی کی کھلی ہے اور شاید قیامت کے دن تک اسی طرح کھلی رہے گی اور جب تک خود حرم قائم ہے، اہلِ حرم اس کی یاد سے اپنا پیمانِ وفا برابر تازہ کرتے چلے جائیں گے ؂

غریب و سادہ ورنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسمعیل

ختم شد